ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرہان لاہور

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل

اسلامی سکول کے خدوخال

تعلیم اور اس کا اسلامی کردار

یکساں قومی نصاب - خدشات و مضمرات

تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)

تدریس القرآن ① برائے طلبہ و طالبات (ڈاک خرچ)

پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیر طبع)

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت - ہینڈ بک و گائیڈ

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم

نصابِ مدنیؒ

مدرسہ ڈسکورسز - مطالعہ و تجزیہ

اصلاحِ دینی مدارس

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟

ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)

خاموش انقلاب - ناگزیر ہے

عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)

حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)

اپنی اصلاح آپ کیسے؟

ترکِ رذائل (احمد جاوید)

اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)

مغربی فکر و تہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش

اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ

اسلام اور ردِّ مغرب

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ - اساس اور لائحہ عمل

مقالاتِ امین (جلد اوّل)

مقالاتِ امین (جلد دوم)

شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

ڈاکٹر محمد امین

مکتبہ البرھان لاھور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت
مؤلف	ڈاکٹر محمد امین
ناشر	مکتبہ البرہان، لاہور
طبع اوّل	اگست ۲۰۲۱ء
قیمت	۱۵۰ روپے

فہرست ایک نظر میں

پیش لفظ

باب اوّل

مسلم نظام تعلیم وتربیت۔ایک تاریخی تجزیہ ماضی ۷

باب دوم

پاکستان میں تعلیم کی موجودہ صورتِ حال حال ۴۶

باب سوم

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت حال ومستقبل ۷۳

حرف آخر

تفصیلی فہرست

پیش لفظ

باب اوّل: مسلم نظامِ تعلیم وتربیت - ایک تاریخی تجزیہ ماضی

فصل اوّل: مسلم عروج کی اساس: مسلم نظامِ تعلیم وتربیت

عہدِ نبوی سے بارہویں صدی ہجری تک ۷

فصل دوم: مسلم زوال میں تعلیم (وتحقیق وتربیت) کا کردار

زوال کے داخلی اسباب

زوال کے خارجی اسباب ۲۷

فصل سوم: تلاشِ راہ گزر - برصغیر کے تعلیمی تجربات ۳۷

باب دوم: پاکستان میں تعلیم کی موجودہ صورتِ حال حال ۴۶

فصل اوّل: جدید تعلیم ۴۸

فصل دوم: دینی مدارس کی تعلیم ۵۶

فصل سوم: اصلاحی کوششیں ۶۴

باب سوم: ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت حال و مستقبل ۷۳

فصل اوّل: نظری پہلو ۷۴

فصل دوم: عملی پہلو ۱۰۴

پیش لفظ

اپریل ۱۹۸۶ء میں جب راقم سعودی عرب میں دس سالہ قیام اور اعلیٰ تعلیم کے بعد واپس لوٹا تو اُس وقت تک اس پر یکسو ہو چکا تھا کہ پاکستان میں دینی سیاسی قوتیں پاکستان کے ریاستی نظام کی اصلاح / نفاذِ شریعت / غلبۂ دین میں اس لیے کامیاب نہیں ہوسکیں کہ انہوں نے پاکستان میں اصلاحِ فرد اور اصلاح معاشرہ پر کما حقہ کام نہیں کیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک فرد میں تبدیلی نہ آئے، معاشرے میں تبدیلی نہیں آسکتی اور جب تک معاشرے میں تبدیلی نہ آئے، ریاست میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

اب سوال یہ تھا کہ فرد کی تبدیلی اور تعمیر سیرت کا کام کون کرے؟ اور یہ کیسے کیا جائے؟ اس کا فوری جواب یہ سمجھ میں آیا کہ یہ کام نظام تعلیم وتربیت کے ذریعے ہوسکتا ہے۔ اپنے نظام تعلیم وتربیت پر ایک نظر ڈالی تو اس کا حال یہ نظر آیا کہ ایک طرف دینی مدارس تھے اور دوسری طرف جدید تعلیم کے ادارے (سکول، کالج اور یونیورسٹیاں)۔ اوّل الذکر نہ دنیاوی علوم سے اعتناء کرتے تھے اور نہ دین کی اس طرح تدریس کر رہے تھے کہ وہ عصری ضرورتوں کو پورا کرتے نظر آتے۔ اور جدید تعلیم کا سارا ڈھانچہ مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب پر مبنی تھا، نہ اس میں دینی تعلیم تھی نہ تربیت اور نہ اس کے مقاصد کا ادراک۔ ان حالات میں متوازن تعمیر شخصیت کا کام کون کرتا اور یہ کام کہاں انجام پاتا؟ اس لیے سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ کرنے کا پہلا کام یہی ہے کہ اس غلط نظام تعلیم کی اصلاح کی جائے اور تعلیم وتربیت کے صحیح تصور کے مطابق ماڈل تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔

اُس وقت سے لے کر آج (۱۴ / اگست ۲۰۲۱ء) کو ان سطور کے رقم کرنے تک ہم اس کام سے غافل نہیں ہوئے۔ اس موضوع پر سوچ بچار اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم تعلیم اور اس کے متعلقات پر ایک درجن کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔ پچھلے گیارہ سال سے ایک

اردو جریدہ 'البرہان' ہر ماہ ان موضوعات پر شائع کرتے ہیں۔ تعلیم پر ہماری پہلی کتاب ''ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی تو اس میں یہ مضامین موجود تھے:

۴۔ ایک ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا قیام
۵۔ ایک ماڈل اسلامی سکول کا قیام
۶۔ ایک ماڈل اسلامی نظام تعلیم کا نقشہ
۷۔ تعلیمی ثنویت کے خاتمے کا طریق کار
۸۔ ماڈل تعلیمی اداروں کا قیام

اس کتاب اور ان مضامین میں یہ بنیادی بات بتادی گئی کہ موجودہ نظام تعلیم میں کیا خرابیاں ہیں اور صحیح اسلامی نظام تعلیم کن خصائص کا حامل ہونا چاہیے۔ اور بلاواسطہ یا بالواسطہ یہ بات بھی سامنے آ گئی کہ ہماری موجودہ یونیورسٹیوں میں کیا خرابیاں ہیں اور نئی مجوزہ یونیورسٹی کن خطوط پر قائم کی جانی چاہیے۔

اس کے بعد ہم ان مفاہیم کی وضاحت کے لیے کام کرتے رہے، اور لوگوں کو تعلیمی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے مجوزہ ماڈل اسلامی یونیورسٹی، سکول اور دینی مدرسہ کے قیام کی دعوت دیتے رہے۔

مجوزہ ماڈل سکول اور دینی مدرسہ کے بارے میں ہماری تفصیلی تحریریں موجود ہیں لیکن ہمیں خیال آیا کہ ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کے حوالے سے ہماری سابقہ تحریر میں اضافوں کی ضرورت ہے اور بہت سے نکات جو بعد میں سامنے آئے، وہ ہمارے دوسرے مضامین اور دوسری کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں لہٰذا مناسب محسوس ہوا کہ انہیں ایک الگ کتابچے کی صورت میں مربوط و منظم طریقے سے پیش کر دیا جائے تا کہ جو لوگ ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھنا چاہتے ہیں، انہیں سارا مواد یکجا مربوط و مرتب مل جائے۔

اللہ کرے ہماری یہ کوشش اسلامی تناظر میں اسلامی تناظر میں ایک نئی یونیورسٹی کے

قیام کی ضرورت واہمیت اور اس کے منہج اور طریق کار کی وضاحت کرے بلکہ عملاً مجوزہ نئی یونیورسٹی کے قیام کی راہ بھی ہموار کرے۔ ہمارا کام اپنی بات وضاحت سے پیش کر دینا اور مجوزہ یونیورسٹی کے قیام کے لیے کوشش کرنا ہی ہے، باقی اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں تو وہ اس ہستی کے ہاتھ میں ہیں جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین.

محمد امین

لاہور، ۱۴/اگست ۲۰۲۱ء

ماضی

باب اوّل

مسلم نظام تعلیم وتربیت - ایک تاریخی تجزیہ

فصل اوّل: مسلم عروج کی اساس: مسلم نظام تعلیم وتربیت
عہدِ نبوی سے ۱۲ویں صدی تک

فصل دوم: مسلم زوال میں تعلیم (وتحقیق وتربیت) کا کردار

فصل سوم: تلاشِ راہ گزر : برصغیر کے تعلیمی تجربات

فصل اوّل: مسلم امہ کے عروج کی اساس: نظام تعلیم وتربیت

ہم نے اپنی کتاب ''مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل'' میں یہ بات تفصیل سے بیان کی ہے کہ تہذیب خواہ کوئی بھی ہو، اس کی اساس اور اس کا انحصار 'آدمی' یا 'فرد' پر ہوتا ہے۔ وہ تہذیب جن اصولوں پر کھڑی ہو اگر وہ اس کے مطابق فرد تیار کرنے میں کامیاب ہوجائے تو وہ تہذیب ترقی کرے گی، طاقتور ہوگی اور کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکے گا۔ اور اگر کوئی تہذیب اپنے عقائد کے مطابق فرد کی تعمیر شخصیت نہ کرسکے تو وہ تہذیب پانی کے بلبلے کی طرح نازک اور ریت کے گھروندے کی طرح کمزور ہوگی اور معمولی جھٹکے سے زمین بوس ہوجائے گی۔ اس حقیقت کا اظہار ایک مغربی مفکر نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

The war of civilzations is fought in the class room

مطلب یہ کہ یہ نظام تعلیم وتربیت ہے جو کسی تہذیب کی قوت اور غلبے کا یا اس کی شکست وریخت کا سبب بنتا ہے۔

مسلم تہذیب اس لیے دنیا پر چھا گئی کہ رسول معظم (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں اپنی امت دعوت کے افراد کی ایسی تعلیم وتربیت کرنے میں کامیاب ہوگئے جس نے پتھروں کو تراش کر ہیرا بنا دیا، جس نے عرب کے بدوؤں کی ایسی تربیت کی کہ دنیا کی سپر طاقتیں ان کی ایمانی اور اخلاقی عظمت کے آگے ڈھیر ہوگئیں۔ اس کامیابی کا اوپن سیکرٹ یہ ہے کہ جب کسی قوم کے افراد کی تعمیر شخصیت ان اصولوں کے مطابق ہو جن پر وہ ایمان رکھتے ہوں اور ان اصولوں کے مطابق عملاً ان کی تعمیر سیرت ہو تو اپنے نظریۂ حیات کے ساتھ ان کی یہ وابستگی اور کمٹمنٹ ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشتی اور ان کے اندر طاقت کا جوار بھاٹا اٹھا دیتی ہے اور ان کے اندر وہ بنیادی انسانی اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں جن کا وجود دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری اور ناگزیر ہوتا ہے۔

اور اس کے برعکس بھی صحیح ہے یعنی اگر کسی قوم کے افراد کی تعلیم وتربیت اس کے نظریۂ

حیات کے مطابق نہ ہوتو اس کے نتیجے میں افراد کی نظریۂ حیات سے وابستگی کمزور ہوجاتی ہے اور اس کا نتیجہ حتماً یہ نکلتا ہے کہ افراد میں وہ صلاحیتیں پیدا ہی نہیں ہوتیں جو دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری ہیں اور یوں وہ قوم دنیا کی دوسری قوموں سے مسابقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے، پٹ جاتی ہے اور شکست کھا کر مغلوب ہوجاتی ہے۔

اس مختصر بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صدر اوّل میں مسلمانوں کے عروج کا بنیادی سبب ان کا نظام تعلیم وتربیت تھا۔ وہ نظام تعلیم وتربیت چونکہ صحیح خطوط پر مسلمانوں کی تعمیر شخصیت کرتا تھا لہٰذا اس کے نتیجے میں مسلمان اپنے نظام حیات سے شدت سے وابستہ ہوگئے اور اس وابستگی کی وجہ سے مسلمانوں میں وہ ساری اہلیتیں اور صلاحیتیں بیدار ہوگئیں جو دنیا میں ترقی اور غلبے کے لیے ضروری ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم اس بات کو ذرا مزید کھولیں گے کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت کس طرح ان کے غلبے اور ترقی کا سبب بنا۔

اگر ہم سہولت فہم کی خاطر آج کی اصطلاحات میں بات کریں تو ہمیں مسلمانوں کے نظام تعلیم اور ان کے تعلیمی اداروں اور ان کی پالیسیوں کو سمجھنے کے لیے اسلام کے تصور علم/ فلسفۂ علم/علمیات (Epistemology) کو جاننا ہوگا۔ اور تصورِ علم چونکہ پیداوار ہوتا ہے ورلڈ ویو (World View) کا (اور ورلڈ ویو سے مراد ہے تصورِ الٰہ، تصورِ انسان اور تصورِ کائنات) لہٰذا ہمیں اسلام کے ورلڈ ویو کو سمجھنا ہوگا۔ اور یہ کہ ورلڈ ویو ان بنیادی نظریات پر مبنی ہوتا ہے جن پر کوئی قوم ایمان ویقین رکھتی ہے لہٰذا ہمیں اسلامی عقاید کو سامنے رکھنا ہوگا۔

ہم چونکہ ان موضوعات پر اپنی کئی تحریروں میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں لہٰذا ہم یہاں انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ بتائیں گے کہ مسلمانوں کے وہ بنیادی عقائد کون سے ہیں جن سے ان کا ورلڈ ویو بنا اور اس ورلڈ ویو سے ان کا فلسفۂ علم وجود میں آیا اور اس فلسفۂ علم سے مختلف علوم پھوٹے۔ نصاب، نصابی کتب اور تعلیمی ڈھانچہ وجود میں آیا اور اس نے کس طرح افراد کی تعلیم وتربیت کا وہ سانچہ تیار کیا جس کے نتیجے میں قرآن کا وہ مطلوب

انسان وجود میں آیا جس نے جہانوں کو زیر وزبر کردیا اور اس کائنات کا سب سے بڑا انقلاب وجود میں آیا۔

اسلام کے بنیادی عقائد

قرآن حکیم کی رو سے اسلام کے بنیادی نظریات وعقائد تین ہیں: توحید، رسالت اور آخرت۔ یہ محض اسلوب بیان ہے نہ کہ تخصیص وتحدید۔ توحید کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور اس کائنات کا خالق، مالک، ربّ، ہادی، علیم، خبیر اور بہت سی دیگر صفات جن کا ذکر قرآن وسنت میں آیا ہے، کی حامل ذات صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ہے۔ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان اس دنیا میں جو زندگی گزارتا ہے وہ عارضی اور فانی ہوتی ہے بلکہ وہ مقدمہ اور دیباچہ ہوتی ہے اس حقیقی اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا جو اس زندگی کے بعد آنے والی ہے۔ یہ زندگی ایک طرح کا امتحان اور دارالعمل ہے جس کا نتیجہ اخروی زندگی میں نکلے گا۔ اور اخروی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے بایں معنی کہ آخرت کی کامیابی کے لیے دنیا کی عارضی ناکامیاں برداشت کی جاسکتی ہیں لیکن آخرت کی ناکامی کی قیمت پر دنیا کی کامیابیاں ہیچ اور حقیر ہیں۔

رسالت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی ہدایت ایک منتخب انسان کے ذریعے بھجواتا ہے جو اس پر عمل کرکے دکھاتا ہے اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کی سرکاری (Official) اور مستند تشریح کرتا ہے۔

اسلام کا ورلڈ ویو

اسلام کے مندرجہ بالا نظریات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کائنات کی بنیادی ترین حقیقت توحید ہے یعنی ایک اللہ تعالیٰ کی ذات کا ان ساری ممکنہ صفات کا حامل ہونا جن کا ہم تصور کرسکتے ہیں۔ وہی الٰہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی ساری مخلوق بالطبع اس کی بندگی واطاعت کرتی

ہے۔صرف دوطرح کی مخلوق کو یعنی انسانوں اور جنّوں کو خود اس نے یہ آزادی دی ہے کہ وہ چاہیں تو اس کی بندگی کا راستہ اختیار کریں اور چاہیں تو نہ کریں لیکن ساتھ ہی اللہ نے انہیں یہ بتادیا ہے کہ اس نے انہیں اپنی عبادت (یعنی پرستش واطاعت) کے لیے پیدا کیا ہے۔اگر وہ ایسا کریں گے تو دنیا وآخرت دونوں میں کامیاب ہوں گے۔گویا اللہ تعالیٰ کی ذات قادرِ مطلق، معبود، حاکم اعلیٰ، مختارِ مطلق اور مطاع کی ہے جبکہ انسان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ایک حقیر عبد کی ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ کی پرستش واطاعت ہی سزاوار ہے۔

اسلام کا تصورِ کائنات یہ ہے کہ یہ دنیا دارالعمل ہے۔یہ زندگی عارضی اور فانی ہے۔اللہ تعالیٰ ایک وقت مقرر پر اس عالَم کو ختم کر کے دوسرے عالَم (عالَم آخرت) کی شروعات کرے گا۔سب انسان دوبارہ زندہ ہوں گے اور اپنے اعمال کی جزاوسزا پائیں گے۔جس نے دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق بسر کی ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی اور اس کی لازوال نعمتوں کا حق دار ٹھہرے گا۔اور جس نے اس کے برعکس دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت کے برعکس عمل کرتے ہوئے گزاری ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کی سزاوعقاب کا مستحق ٹھہرے گا اور یہ ابدی زندگی ہوگی۔

اسلام کا تصورِ علم

مذکورہ بالا عقائد اور مذکورہ بالا ورلڈ ویو کے بعد اب ہم آتے ہیں اسلام کے تصورِ علم کی طرف۔اس حوالے سے ہمارے سامنے چار بنیادی سوال آتے ہیں:

۱۔ علم کیا ہے؟
۲۔ علم کا منبع وماخذ کیا ہے؟
۳۔ علم کی اقسام کیا ہیں؟
۴۔ علم کی غایت کیا ہے؟

اب ہم قرآن حکیم کی روشنی میں ان سوالوں کے واضح جواب دیں گے:

علم کیا ہے؟

قرآن حکیم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو علم عطا کیا ہے وہ اپنی غایت کے لحاظ سے دو طرح کا ہے: ایک علم انسان کی ہدایت کے لیے اور دوسرے وہ علم جو اللہ نے انسان کو دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے کائنات میں تصرف کرنے کے حوالے سے عطا کیا ہے۔

علمِ ہدایت

❁ قرآن حکیم کی ابتداء ہی میں، سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سکھایا کہ ہم اس سے یہ درخواست کریں کہ وہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے، ہدایت کا سیدھا راستہ ہمیں دکھائے۔ اور پھر سورہ بقرہ کی ابتداء ہی میں انسانوں کی یہ درخواست قبول فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ یہ لو ہدایت کی کتاب۔ جو ہدایت سے متعلق ہر سوال کا حتمی، یقینی اور مستند جواب دیتی ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ [البقرہ ۲:۲]

''یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں، یہ ہدایت ہے ان ڈر رکھنے والوں کے لیے۔''

❁ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ اس نے انسان میں بالطبع یعنی (Built in) اور اس کے مزاج اور جین (Gene) میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ اس کی ذات کا ادراک کر سکے اور برے بھلے اور غلط و صحیح میں تمیز کر سکے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۝﴾ [الاعراف ۷:۱۷۲]

''اور جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو

نکالا تھا، اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا (اور پوچھا تھا کہ) کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ کیوں نہیں؟ ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں (اور یہ اقرار ہم نے اس لیے لیا تھا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔''

- ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ [الشمس ۹۱:۷،۸]

''اور قسم ہے انسانی جان کی، اور اُس کی جس نے اُسے سنوارا، پھر اُس کے دِل میں وہ بات بھی ڈال دی جو اس کے لیے بدکاری کی ہے اور وہ بھی جو اُس کے لیے پرہیزگاری کی ہے۔''

لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی صفت رحمت کی بناء پر انسانوں سے شفقت کرتے ہوئے اور ان پر اتمامِ حجت کی خاطر رسول معبوث کیے اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں تاکہ انسانوں کو حقیقت کا علم ہو جائے اور راہ ہدایت ان پر واضح ہو جائے اور کل قیامت کو وہ اللہ کے حضور یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو ہدایت کا علم ہی نہیں تھا یا ہدایت کا راستہ ہم پر واضح نہیں تھا چنانچہ فرمایا:

- ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝﴾ [الاسراء ۱۷:۱۵]

''اور ہم کبھی کسی کو اُس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک کوئی پیغمبر (اُس کے پاس) نہ بھیج دیں۔''

- ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝﴾ [القصص ۲۸:۵۹]

''اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ وہ بستیاں یونہی ہلاک کر ڈالے جب تک اُس نے اُن بستیوں کے مرکزی مقام پر کوئی رسول نہ بھیجا ہو جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو اُس وقت تک ہلاک کرنے والے نہیں ہیں جب تک ان کے باشندے ظالم نہ بن جائیں۔''

ہدایت کے اس علم سے کیا مراد ہے یا اس کی غایت کیا ہے؟ اس علم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اس دنیا کی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق بسر کرے۔ اسی کو دین اور شریعت کہتے ہیں اور اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے یعنی انسان کو بحیثیت عبد صرف یہی سزاوار ہے کہ وہ دنیا کی یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں گزارے۔ اللہ کی لامحدود اور غیر مشروط اطاعت اور بندگی ہی کا نام اسلام ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اسے بحیثیت دین صرف اسلام ہی قابل قبول ہے:

۔ ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران ۳:۱۹]

''دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔''

۔ ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ﴾ [آل عمران ۳:۸۵]

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

۔ ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾ [الصف ۶۱:۹]

''وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے خواہ مشرکوں کو برا ہی لگے۔''

علم کائنات

یعنی وہ علم جو انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے اور قطع اسباب کے قابل بناتا ہے۔ انسان کی بنیادی پوزیشن اگرچہ اللہ کے مقابلے میں حقیر عبد کی ہے اور اسے بلاشروط وحدود اللہ کی پرستش وعبادت ہی سزاوار ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت ومشیت سے انسان کو دو امور میں صاحب اختیار بنایا ہے: ایک یہ کہ وہ چاہے تو اللہ کو معبود اور اس کی ہدایت کو حق مانے اور چاہے تو نہ مانے (اگرچہ نہ ماننے کی صورت میں دنیا میں جو فساد پھیلتا اور اس کی

زندگی میں جو زہر گھلتا ہے اور آخرت میں جو ناکامی، رسوائی اور عذاب اس کے حصے میں آتا ہے، اس کے بارے میں بھی اسے وضاحت سے بتادیا) اور دوسرا یہ کہ اسے کائنات میں تصرف کا اختیار دیا اور اکثر مخلوقات کو اس کے تابع کر دیا کہ وہ جیسے چاہے انہیں استعمال میں لاسکے (دوسری مخلوقات سے ہماری مراد ہے جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ)۔ کائنات اور مخلوقات میں تصرف کا علم بھی اللہ ہی نے انسان کو دیا ہے اور اس کی صلاحیت بھی اللہ ہی نے اس کے اندر رکھی ہے۔

اس کا ذکر قرآن حکیم نے تخلیق انسان کے حوالے سے کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو فرشتوں کے ذہن میں لفظ خلیفہ سے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ اگر یہ انسان صاحب اختیار ہوگا تو امکان ہے کہ یہ زمین میں فتنہ وفساد پھیلائے گا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلی بات تو یہ فرمائی کہ ہم نے انسان کو بااختیار بنایا ہے اور اسے زمین میں تصرف کا علم بھی دیا ہے:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾[البقرہ ۲:۳۱]

''اور اس نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔''

جب کہ فرشتوں کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا لہٰذا فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی یہ علمی برتری تسلیم کر لی۔ چند ہی آیات بعد قرآن نے جنت میں آدم علیہ السلام کی توبہ کا ذکر کرنے کے بعد اللہ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ:

﴿ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝﴾ [البقرہ ۲:۳۸،۳۹]

''جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے اور جنہوں نے (اس کو) قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ دوزخ میں جانے والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔''

یعنی انسان کے پاس میری ہدایت کا علم آئے گا تو جس نے اس کی پیروی کی وہ کامیاب ہوگا اور جس نے اسے رد کیا اور اس کی نافرمانی کی تو اللہ کی ناراضی اور جہنم کی آگ اس کا مقدر بنے گی۔

دنیا کی زندگی گزارتے ہوئے کائنات میں تصرف کا یہ علم بھی ہر انسان کی سرشت اور جبلت میں Built in رکھ دیا گیا ہے اور یہ ہر انسان کو بالطبع حاصل ہوتا ہے جیسے انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی سانس لینے لگ جاتا ہے اور ماں کا دودھ چوسنے لگ جاتا ہے اور کسی کو اسے سکھانا نہیں پڑتا کہ سانس کیسے لیتے ہیں اور ماں کی چھاتی سے دودھ کیسے چوستے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اسے دل و دماغ اور ایسی جسمانی قوتیں عطا کی ہیں کہ وہ بڑا ہو کر علم سیکھتا ہے، مہارتیں سیکھتا ہے اور اپنی بقا کے لیے اور اکتساب رزق کی خاطر زراعت، تجارت، صنعت کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے اور اپنے دفاع اور شکار کے لیے ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ ان سرگرمیوں کی تنظیم کے لیے انسان کو اس علم کی ضرورت نہیں ہے جسے ہم نے سطور بالا میں 'علم ہدایت' سے تعبیر کیا ہے بلکہ اس کے لیے اس کے عقلی و جسمانی قوی اور تجربات اس کو کفایت کرتے ہیں۔ زراعت کے ایک ایسے ہی معاملے میں (کھجور کے نر اور مادہ پودوں میں پیوند لگانے کے حوالے سے) نبی مکرم ﷺ نے فرمایا تھا "انتم اعلم فی امور دنیا کم"[1] یعنی تم اپنے دنیاوی امور کے تخصصات اور مہارتوں میں خود کفیل ہو، اس میں تمہیں میری رہنمائی کی ضرورت نہیں البتہ علم ہدایت صرف مجھ ہی سے لو اور اس پر عمل کرو۔

علم کا منبع کیا ہے؟

علم کا منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیونکہ وہی انسان کا اور اس کائنات کا اور ساری مخلوقات کا خالق ہے اور خالق سے بڑھ کر مخلوقات کے بارے میں علم کون رکھ سکتا ہے؟

---

[1] صحیح مسلم: ۲۳۶۳

انسان کا بلکہ رسولوں اور ملائکہ کا علم بھی محدود ہوتا ہے اور اتنا ہی ہوتا ہے جتنا انہیں اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔ ٹھوس، حتمی، لامحدود اور یقینی علم صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ انسان اکثر اپنی ہوائے نفس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ وہ انسانی علم جو اللہ کے علم کے خلاف ہو وہ علم نہیں جہالت اور گمراہی ہے۔ اور جو انسان اللہ کے علم کا انکار کرے اور اپنی عقل اور ہوائے نفس کی پیروی کرے وہ گویا انسان نہیں حیوان ہے۔ یہ سارے حقائق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بیان فرمائے ہیں۔ دیکھیے آیات ذیل:

_ ﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲﴾ [البقرہ ۲:۳۲]

''بے شک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔''

_ ﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۱۵﴾ [البقرہ ۲:۱۱۵]

''بے شک اللہ صاحبِ وسعت اور باخبر ہے۔''

_ ﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰﴾ [الانعام ۶:۵۰]

''(اے نبی!) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس حکم پر چلتا ہوں جو مجھے (اللہ کی طرف سے) آتا ہے۔ کہہ دو کہ بھلا اندھا اور آنکھ والے برابر ہوتے ہیں؟ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔''

_ ﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ﴾ [الانعام ۶:۱۱۹]

''اور بہت سے لوگ بے سمجھے بوجھے اپنے نفس کی خواہشوں سے لوگوں کو بہکا رہے ہیں۔''

_ ﴿فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۭ﴾

[القصص۲۸:۵۰]

''پھر اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی ہی کرتے ہیں۔''

۔﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾[العنکبوت۲۹:۶۲]

''بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

۔﴿قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾[الاحقاف۴۶:۲۳]

''(انہوں نے) کہا کہ (اس کا) علم تو اللہ ہی کو ہے۔''

۔﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الجمعہ۶۲:۵]

''جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بار تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے جن پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔ جو لوگ خدا کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کی مثال بری ہے۔اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

علم کی اقسام

قرآن وسنت کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم اہل علم علوم کی تین اقسام بیان کرتے ہیں:

۱۔ علوم نقلیہ ۲۔ علوم آلیہ ۳۔ علوم حِکمیہ (یا علوم عقلیہ)

علوم نقلیہ

علوم نقلیہ سے مراد ہے علم وحی یعنی قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ۔ مسلمان اپنے عقیدے کی رو سے قرآن حکیم کی نصوص اور سنت رسول کے بلا شروط وحدود اتباع کے پابند ہیں۔ وہ ان میں کوئی کمی بیشی کرنے کے مجاز ہی نہیں، وہ محض ان کے مقلدانہ اتباع کے پابند

ہیں۔ ان کی تفہیم وتطبیق اور کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں مسلمانوں میں رائے کا اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان کے واجب العمل ہونے اور ان کے نا قابل تغیر ہونے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

علوم آلیہ

وہ علوم جو علوم نقلیہ کی تفہیم وتطبیق میں معاون ہیں جیسے عربی زبان وادب اور علوم الحدیث میں روایت ودرایت کا علم اور علوم القرآن میں تاویل وتفسیر اور ناسخ ومنسوخ کا علم۔ علوم آلیہ درحقیقت علوم حِکمیہ ہی ہیں لیکن علوم نقلیہ کے فہم میں آلہ (ذریعہ) اور معاون ہونے کی وجہ سے انہیں علوم آلیہ کہا جاتا ہے۔

علوم حِکمیہ

علوم حِکمیہ وہ علوم ہیں جن میں نصوص قرآن وسنت کے ساتھ انسانی عقل وتجربہ کا بھی دخل ہوتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں: ایک علوم عمرانیہ اور دوسرے سائنس وٹیکنالوجی۔ عمرانی علوم وہ ہیں جن میں تقریباً آدھا کردار قرآن وسنت کی نا قابل تغیر نصوص کا ہوتا ہے اور باقی آدھا اجتہاد وعقل کا جیسے معاشیات، سیاسیات، قانون، تعلیم، فلسفہ وغیرہ کا۔ رہے وہ علوم جن میں علوم نقلیہ کا کردار بہت کم ہے اور وہ زیادہ تر انسانی عقل وتجربہ پر مبنی ہیں جیسے زراعت، صنعت، تجارت وغیرہ (جن کا شمار آج کل سائنس وٹیکنالوجی میں کیا جاتا ہے) تو مسلم ماہرین تعلیم انہیں علوم میں شمار کرنے کی بجائے ان کے لیے فنون کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔

علم کی غایت

قرآن وسنت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں علم برائے عمل اور علم برائے زندگی ہے یعنی صرف جان لینا اور مان لینا ہی کافی نہیں جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔ لہٰذا اسلام میں علم کے ابلاغ اور تعلیم کی غایت صرف علم پہنچا دینا نہیں بلکہ اس طرح پہنچا دینا ہے کہ وہ عمل پر منتج

ہو۔اسے تعلیمی زبان میں تربیت اور قرآنی اصطلاح میں تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔گویا قرآن کی رو سے تعلیم کی غایت تربیت اور تزکیۂ نفس ہے۔چونکہ ہر نظامِ تعلیم طالب علم کی تربیت کرتا ہے خواہ وہ نظامِ تعلیم اسلامی ہو یا غیر اسلامی۔اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ تعلیم اسلامی ہونی چاہیے اور اس کی غایت اسلامی تربیت ہونی چاہیے تاکہ جو بچہ اسلامی تعلیم حاصل کرے اس کی اسلامی تربیت ہو یعنی اس تعلیم کے نتیجے میں وہ ایک اچھا باعمل مسلمان بنے۔تلخیصاً عرض ہے کہ تعلیم اسلامی اس وقت ہوتی ہے جب ''وہ کتاب وحکمت'' پر مبنی ہو اور تربیت اسلامی اس وقت ہوتی ہے جب وہ طالب علم کے نفس کا تزکیہ وتربیت اس طرح کرے کہ وہ اس کے نتیجے میں اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کے قابل ہو جائے۔یہ بات کہ علم وتعلیم سے مقصود تربیت وتزکیۂ نفس ہے قرآن حکیم میں کئی انداز سے کہی گئی ہے:

❁ قرآن حکیم نے جہاں نبی کریم ﷺ کے کارِ نبوت اور اس کے طریق کار کا ذکر کیا ہے، وہاں کہیں تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے تزکیہ کا ذکر کیا ہے جیسے: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ [آل عمران ۳: ۱۶۴] اور کہیں اس کے بعد، جیسے فرمایا: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ [البقرہ ۲: ۱۲۹] جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تعلیم سے اوّل وآخر مطلوب تزکیۂ نفس اور تعمیر شخصیت ہی ہے۔

❁ صرف جان اور مان لینا اور زبان سے اقرار کر لینا کافی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ [الصّف ۶۱: ۲، ۳]

''مومنو! تم ایسی باتیں کیوں کہا کرتے ہو جو کیا نہیں کرتے، اللہ اس بات سے سخت بیزار ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔''

❁ انبیاءکو کہا گیا کہ لوگوں تک دین کی دعوت پہنچاؤ تا کہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو سکے۔

﴿اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝﴾ [النازعات۷۹:۱۷تا ۱۹]

''جب اُن کے پروردگار نے ان کو پاک میدان (یعنی) طویٰ میں پکارا (اور حکم دیا) کہ فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو رہا ہے اور (اس سے) کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرا تزکیہ ہو اور میں تجھے تیرے پروردگار کا رستہ بتاؤں تا کہ تجھ کو خوف (پیدا) ہو۔''

❁ صرف علم رکھنا کافی نہیں جب تک وہ علم دل و دماغ کو فتح کر کے عمل میں نہ ڈھلے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ [الحجرات۴۹:۱۴]

''دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو کہ ہم مطیع ہوئے ہیں اور ایمان تو ہنوز تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اور تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

❁ تزکیۂ نفس اہم ترین ہے کیونکہ دنیا و آخرت میں کامیابی کا انحصار اسی پر ہے اور یہ کہ نفس کا تزکیہ ہوگا، صحیح تربیت ہوگی تو پھر ہی فرد اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکے گا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ [الشمس۹۱:۹،۱۰]

''کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا، اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔''

❁ انبیاء کرام کا مقصد بعثت لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرنا ہی تھا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝﴾ [الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹]

''بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے یہ بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

تعلیم ۔عہد رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں

قرآن حکیم کے تصور تعلیم پر اس ابتدائی گفتگو کے بعد اب آیئے عہد رسالت میں تعلیم کی صورت حال پر ایک نظر ڈالیں۔ علم و تعلیم برائے ہدایت جس کا منبع وحی الٰہی ہے، کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نصاب قرآن حکیم تھا۔ مسجد نبوی کا صُفّہ اس کی تعلیم گاہ تھی۔ تلمیذ صحابہ قرآن پڑھتے اور اسے یاد کرتے نیز اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی تشریح کرتے، تفصیل بتاتے اور اس پر عمل کا طریقہ واضح کرتے۔

دوسری طرز کا علم و تعلیم جس کا منبع انسانی عقل و تجربہ تھا جیسے زراعت، صنعت، تجارت، دفاع وغیرہ۔ اس میں نوشت وخواند (Reading writing skill) سے لے کر ادب عالیہ (شعر، خطابت، علم الانساب وغیرہ) تک شامل تھا۔ مثلاً جنگ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے اور پڑھے لکھے تھے ان کے ذمے لگایا گیا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو نوشت وخواند سکھا دیں تو وہ آزاد ہوں گے۔ ظاہر ہے اس تعلیم کا تعلق 'علم ہدایت' سے نہیں تھا۔ اسی طرح تعلیم صحت میں آپ نے خود بھی دوڑ میں حصہ لیا اور دوسروں کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ حربی تعلیم اور دفاعی مہارتوں میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نیزہ بازی اور تیر اندازی کی مشقوں کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق بھی 'علم ہدایت' سے نہیں تھا۔ زراعت میں

کھجوروں کو پیوند کرنے کے معاملے میں آپ (ﷺ) نے مدینہ کے کاشتکاروں کو فرمایا کہ تم اسے زیادہ بہتر سمجھتے ہو کیونکہ اس بات کا تعلق بھی 'علم ہدایت' سے نہیں تھا جو بحیثیت رسول آپ (ﷺ) کا کردار تھا اور مکہ چونکہ پہاڑی علاقہ تھا اور زراعت وہاں عام نہ تھی لہٰذا آپ (ﷺ) کو اس کا ذاتی تجربہ بھی نہ تھا لہٰذا آپ (ﷺ) نے مدنی کاشتکاروں سے فرمایا کہ تم خود اس معاملے میں اپنی عقل و تجربہ کے مطابق فیصلہ کرو۔

دعوت و تبلیغ بھی غیر رسمی تعلیم کی ایک معروف شکل ہے جس میں داعی لوگوں تک اپنی بات پہنچاتا ہے اور بعض اوقات ذاتی ملاقات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دعوت و تبلیغ اور شخصی ملاقاتیں غیر رسمی تعلیم کا بہت موثر ذریعہ ہیں اور ہزاروں سالوں سے انسانی معاشرے میں مروج ہیں۔ پہلے انبیاء کی طرح ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے بھی دعوت و تبلیغ اور شخصی ملاقاتوں سے اشاعت دین کا کام موثر طور پر کیا۔

یہاں ایک اور معاملہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ نوشت و خواند اور رسمی تعلیم بلاشبہ آج ہمیں بہت اہم اور بالکل ناگزیر محسوس ہوتی ہے لیکن آج سے صدیوں پیشتر سعودی عرب جیسے صحرائی ملک میں جہاں قبائل اکثر تلاش رزق میں صحراء میں متحرک رہتے تھے وہاں نوشت و خواند کا رجحان بہت کم تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو لوگ نوشت و خواند سے محروم تھے وہ علم و دانش سے بھی محروم تھے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ وہاں علم و دانش کی روایت 'تحریری' نہیں 'زبانی' (Oral) تھی اور سارے لوگ اس سے حسب صلاحیت متمتع ہوتے تھے۔ پھر انسانی معاشرے میں یہ مشاہدہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص علم و معلومات مہیا کرنے والی کسی ایک حِس سے محروم ہو جائے یا اسے کسی سبب سے استعمال نہ کر سکے تو دوسری حِس تیز ہو جاتی ہیں مثلاً جو شخص نابینا ہو جائے وہ دیکھ نہیں سکتا اور پڑھ لکھ کر معلومات حاصل نہیں کر سکتا لیکن اس کی سننے کی اور سن کر یاد کرنے کی حِس عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ تیز (sharp) ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص لکھی ہوئی چیز پڑھ نہ سکتا ہو تو اس کی سن کر یاد کر لینے کی حِس تیز ہو جاتی ہے جیسا کہ عہد نبوی کے عربوں میں ہوتا تھا کہ

ایک شخص سو شعر کا قصیدہ صرف ایک دفعہ سنتا تھا اور وہ اسے ازبر ہو جاتا تھا حالانکہ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہوتا تھا۔ ہمارا اپنا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ ہم بچپن میں سکول میں پہاڑے (Table) یاد کرتے تھے اور وہ ہمیں ساری عمر یاد رہے اور آج بھی ہم انہیں استعمال کرتے ہیں لیکن ہمارے پوتے پوتیوں نے ہماری طرح بچپن میں پہاڑے زبانی یاد نہیں کیے اور نہ وہ انہیں استعمال کرتے ہیں کیونکہ انہیں کیلکولیٹر میسر ہے لہٰذا انہیں پہاڑے یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور نہ وہ انہیں یاد ہیں۔

اس وضاحت سے مقصود یہ ہے کہ اگر آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ امی تھے بایں معنی کہ وہ لکھنے پڑھنے کی مہارت نہ رکھتے تھے تو اس میں عیب کی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ علم و دانش میں سب سے آگے تھے۔ مقامی اور معاشرتی علم و دانش کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو علم و دانش وحی کے ذریعے عطا فرمائی وہ لکھنے پڑھنے کی مہارت نہ رکھنے کے باوجود آپ ﷺ سننے، یاد کرنے، اس کا فہم رکھنے اور اسے دوسروں تک منتقل کرنے کی صلاحیت سے آپ بدرجہ اتم بہرہ ور تھے اور یہی علم اور تعلیم و تعلم سے مقصود ہوتا ہے۔

عہد صحابہ

عہد صحابہ میں وہ علمی و تعلیمی روش جاری رہی جس کی بناء آپ ﷺ نے رکھی تھی۔ علم ہدایت میں البتہ یہ اضافہ ہوا کہ اب قرآن حکیم کے ساتھ سنت رسول اور احادیث رسول (ﷺ) بھی نصاب کا حصہ بن گئیں اور علم الفرائض (احکام وراثت) اور مسائل زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں احکام فقہ بھی بتدریج منضبط ہونے لگے۔ علوم حِکمیہ میں گورننس اور دفاع کے شعبوں میں دو بڑے اقدام ہمیں نظر آتے ہیں۔ ایک حضرت عمرؓ نے اہل فارس کا انتظامی اور مالی پیکیج قبول کر کے اسے اپنے ہاں رائج کر دیا جسے 'دیوان' کا نام دیا گیا۔ چونکہ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی لہٰذا اسے صحابہ کرامؓ کا اجماع یا کم از کم اجماع سکوتی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دفاع میں حضرت امیر معاویہؓ نے رومیوں کا مقابلہ

کرنے کے لیے بحری بیڑہ بنانے کا حکم دیا حالانکہ صحرائی عربوں میں اس کا تصور محال تھا۔

ابتدائے اموی عہد کی ایک بڑی اصولی تبدیلی

حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت نے امت کو گہرا صدمہ پہنچایا۔ اس عہد میں ایسا لگتا ہے کہ امویوں اور ہاشمیوں کی قبائلی عصبیت وکشمکش پس پردہ کام کررہی تھی لیکن یہ دونوں حضرات رسول کریم ﷺ کے قریبی عزیز تھے اور آپ (ﷺ) سے متوارث اسلامیت، علم وتقویٰ، شجاعت وشہامت اور خاندانی نجابت کے امین ومظہر تھے۔ ان کی مظلومانہ شہادت محض ایک مقامی اور وقتی حادثہ ثابت نہ ہوئی بلکہ اس کے دوررس اور دیرپا منفی اثرات نکلے جو آج تک جاری ہیں۔ ہم اس کے دوسرے پہلوؤں (مثلاً تشیع کا ابھرنا، ریاست کا شورائیت اور میرٹ کی بجائے خاندانی وراثت میں تبدیل ہوجانا وغیرہ) سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اپنے موضوع پر فوکس کرتے ہیں اور یہ عرض کرتے ہیں کہ تعلیم وتربیت کے لحاظ سے یہ واقعات ایک بڑی اصولی تبدیلی (Policy shift) کا سبب بنے اور وہ یہ کہ امت کے اہل علم وصلاح نے سیاسی کشمکش سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا اور معاشرے کی مدد سے، نہ کہ ریاست کی قوت سے، پرائیویٹ سیکٹر میں آزادانہ طور پر تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفس اور فقہ واجتہاد پر فوکس کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بعض دوسرے پہلوؤں سے گو اس فیصلے کے بعض کمزور نتائج نکلے ہوں لیکن تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفس کے حوالے سے، جو فرد کی تعمیرِ شخصیت اور اصلاح سیرت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، اس کے نہایت مثبت اور خوشگوار نتائج نکلے اور مسلم معاشرے اور ریاست کو اگلے پانچ سو سال میں (سقوط بغداد تک) جو عروج وغلبہ ملا اس کی بنیادی وجہ، ہماری رائے میں، علم، تعلیم (تدریس، تحقیق، تربیت) اور تزکیۂ نفس کا فروغ اور ترقی تھی۔

مسلم عروج اور اس میں تعلیم (وتربیت وتحقیق) کا کردار

ہماری یہ حتمی رائے ہے کہ مسلمانوں کے عروج کا بنیادی سبب ان کی صحیح تعلیم وتربیت

تھی۔ یہاں تعلیم سے مراد صرف آج کل کی رسمی تعلیم (جو سکول، کالج، یونیورسٹی یا دینی مدرسہ میں ہوتی ہے) نہیں بلکہ وہ چیز بھی ہے جسے ہم آج کل 'غیر رسمی تعلیم' کہتے ہیں وہ اُس وقت تعلیم کا زیادہ مصداق تھی جسے مسلم روایت میں دعوت واصلاح اور دعوت وتبلیغ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم انبیاء سے جس 'تعلیم' کی نسبت کرتے ہیں وہ دعوت وتبلیغ اور دعوت واصلاح تھی نہ کہ آج کل کی رسمی تعلیم۔ اس تعلیم کا مطلب امت محمدیہ کے تناظر میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس ہے۔ تعلیم کتاب یعنی قرآن حکیم کی تعلیم اور تعلیم حکمت میں دنیاوی علوم وفنون کی ایسی تعلیم جو حکمت قرآن کے خلاف نہ ہو اور تزکیۂ نفس بمعنی تعمیر شخصیت وکردار۔ اور تحقیق علوم اسلامیہ میں بصورت اجتہاد اور عمرانی وسائنسی علوم میں بطور ابتکار اور اکتشافات جدیدہ۔ اس تعلیم کا نتیجہ تھا ایمان جو علم وتعلیم کے ساتھ مل کر عمل صالح اور تعمیر کردار کی بنیاد بنتا تھا۔ اس سٹرکچر سے ابھرنے والا فرد مضبوط معاشرتی واجتماعی ڈھانچے اور عظیم مسلم تہذیب کی بنیاد بنا۔

بلاشبہ مسلم معاشرہ ایک انسانی معاشرہ تھا فرشتوں کا معاشرہ نہ تھا چنانچہ اس میں خامیاں اور کمزوریاں بھی درآئیں خصوصاً اس وجہ سے کہ صحابہ کرام کی عظیم ایمانی قوت واخلاقی جرأت کی کوئی معاشرہ مزاحمت نہ کرسکا اور لوگ برضا ورغبت تیزی سے اسلام قبول کرتے گئے لیکن جس سرعت سے اشاعت اسلام ہوئی اتنی سرعت سے نومسلموں کی تربیت نہ ہوسکی۔ پھر فتوحات اور معاشی عدل کی وجہ سے معاشی خوشحالی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور دولت وآسائشوں کی کثرت نے اخلاقی بگاڑ اور آخرت سے غفلت میں اضافہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کو عطا کردہ اصلاح کا خود کار نظام متحرک ہوگیا جسے 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کہا جاتا ہے۔ اس نے ایک طرف مساجد کے ساتھ مدارس کی صورت میں تعلیمی اداروں کی شکل اختیار کرنی شروع کی اور دوسری طرف صلحاء نے زاویوں/ خانقاہوں کی صورت میں عموماً آبادی سے باہر تربیت گاہیں قائم کرنی شروع کردیں جہاں طالبان تزکیہ آکر چندے قیام کرتے اور اپنے ایمان کو صیقل کرتے تاکہ وہ اسلامی تعلیمات

کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ یہ تعلیمی نظام پرائیویٹ سیکٹر میں علماء کرام کے ہاتھوں میں تھا اور وہ معاشرے کی مدد سے اسے چلاتے تھے۔ بسا اوقات ریاست کے حکمران اور امراء بھی ان کی مدد کرتے تھے لیکن یہ نظام بہرحال حکومتی کنٹرول میں نہ تھا بلکہ آزاد تھا۔

مدرسوں کا یہ تعلیمی اور خانقاہوں کا یہ تربیتی نظام بالعموم استاد مرکز تھا یعنی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ حکومت یا معاشرہ کوئی تعلیمی ادارہ قائم کرتا اور اس میں استاد کی تعیناتی ہوتی اور یوں اساتذہ آتے جاتے رہتے بلکہ جہاں کوئی صاحب کمال پڑھ لکھ کر، تدریس وتحقیق کے بعد اس قابل ہوجاتا کہ وہ افراد معاشرہ کو تعلیم دے سکے تو اس کا گھر مدرسہ بن جاتا اور طلبہ کی کثرت کی صورت میں کسی کھلی جگہ پر منتقل ہوجاتا۔ اور یہ سلسلہ علوم اسلامیہ تک محدود نہ تھا۔ اس میں ابتدائی تعلیم کے مدارس (جنہیں ''کُتّاب'' کہا جاتا تھا) بھی تھے جو چھوٹے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے اور علوم حِکمیہ کے اساتذہ وماہرین بھی جیسے طبیب، مہندس، کیمیادان، ماہرین فلکیات اور ماہرین عمرانیات وانسانیات جیسے مورخ، فلسفی، ادیب، شاعر ورّاق وغیرہ اور ماہرین صنعت وفنون بھی جیسے لوہار، بڑھئی، جولاہے، معمار وغیرہ سب اس میں شامل تھے۔

اس عہد کو مسلم تہذیب کا سنہری دور کہا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں مسلمان دین واخلاق ہی میں نہیں علوم حِکمیہ میں بھی دوسری قوموں سے آگے تھے۔ اگرچہ اس گیہوں کو گھن لگنا شروع ہوگیا تھا اور معاشرے میں خرابیاں موجود تھیں لیکن خوبیوں کا پلڑا بہرحال بھاری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خوارزم کی عظیم سلطنت اور بغداد کی خلافت اگرچہ منگولوں کے سیلاب کا رخ نہ موڑ سکیں اور اس میں بہہ گئیں لیکن مسلم فکر وتہذیب میں ابھی اتنی جان اور قوت باقی تھی کہ نصف صدی کے اندر اندر مسلم فکر وتہذیب ان حملہ آوروں کو نہ صرف فکری طور پر زیر کرنے میں کامیاب ہوگئی بلکہ اس نے اپنی کھوئی ہوئی سیاسی اور حربی قوت بھی بحال کرلی اور اگلے سات سو برس تک اپنے غلبے اور اقتدار کو میرٹ پر طول دینے میں کامیاب ہوگئی۔

فصل دوم

مسلم زوال میں تعلیم (وتربیت وتحقیق) کا کردار

مبحث اوّل میں ہم نے دیکھا کہ مسلم امہ ایک ہزار سال تک اپنی عظمت کا پھریرا لہرانے کے بعد آہستہ آہستہ ڈوبنا شروع ہوئی یہاں تک کہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری میں اس کا کمزور سیاسی نظام (خلافت) ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۴ء میں غیروں کے ہاتھوں نہیں، طاقتور الحادی مغربی غالب تہذیب سے مرعوب مسلمانوں کے ہاتھوں تار تار ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ اس زوال کے اسباب کیا تھے؟ یا ہم اپنے موضوع کے حوالے سے سوچیں تو سوال یہ بنتا ہے کہ کیا اس زوال کے اسباب میں مسلم نظام تعلیم وتربیت کا بھی کوئی ہاتھ تھا؟

ہماری یہ حتمی اور سوچی سمجھی رائے ہے کہ جس طرح مسلمانوں کے عروج کا بنیادی سبب داخلی تھا یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے سنہری اصولوں پر عمل کرنا، اسی طرح ان کے زوال کا بنیادی سبب بھی داخلی ہے یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے اصول پر عمل نہ کرنا۔

ہم اس سے انکار نہیں کرتے کہ مسلم زوال کے دوسرے داخلی اسباب بھی تھے جیسے سیاسی عدم استحکام، اخلاقی اضمحلال، معاشی جمود، سماجی تشتت، فرقہ واریت، علاقائی اور لسانی عصبیتیں اور حربی تنزل.... وغیرہ۔ ہم ان میں سے کسی کا انکار نہیں کرتے اور کسی کو غیر اہم نہیں کہتے بلکہ کوئی محقق جب مسلم زوال پر تحقیق کرے گا تو وہ ان عوامل پر تفصیل سے بحث کرے گا اور اسے کرنی چاہیے۔ لیکن اس وقت ہماری بحث کا دائرہ محدود ہے۔ ہم یہاں صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس زوال میں تعلیم (اور تربیت وتحقیق) کا بھی کوئی کردار تھا؟ اور اگر تھا تو وہ کردار جزوی اور ضمنی تھا یا بنیادی؟

اسی طرح مسلم زوال کے خارجی اسباب بھی تھے جن کی طرف ہم مختصر اشارہ بعد میں کریں گے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلم زوال میں تعلیم (وتربیت وتحقیق) کا کردار تھا۔ اب اس کے بارے میں ہم کچھ تفصیل میں جائیں گے۔

تعلیم کا وسیع تر مفہوم

دیکھیے جب ہم تعلیم (وتربیت وتحقیق) کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو ہمیں اس کے مفاہیم کی وسعت کو ذہن میں رکھنا چاہیے: تعلیم میں قرآن حکیم کی رو سے تعلیم کتاب وحکمت دونوں شامل ہیں۔

تعلیم کتاب

تعلیم کتاب سے مراد ہے قرآن حکیم کی تعلیم اور قرآن حکیم کی تعلیم کے کئی پہلو ہیں:

* اس پر ایمان لانا، اس کی تجوید وتلاوت، فہم نصوص، ان پر عمل، ان کا دوسروں تک ابلاغ وغیرہ۔

* وہ علوم جن کے بغیر فہم قرآن ممکن نہیں جیسے:

- سنت رسول اللہ ﷺ جو درحقیقت الکتاب کی وہ وضاحت ہے جس کی حیثیت سرکاری اور رسمی (Official) تشریح کی ہے کیونکہ قرآن نبی ﷺ پر نازل ہوا تھا[1] اور اللہ نے آپ کو اس کی تشریح وتبیین کا حکم دیا تھا۔[2]

- اس میں عربی زبان کی تعلیم بھی شامل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن عربی زبان میں نازل کیا[3] اور اسے پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا اس وقت تک آسان نہیں ہوسکتا جب

---

[1] المائدہ ۵:۴۸

[2] النحل ۱۶:۴۴

[3] یوسف ۱۲:۲

تک آدمی وہ زبان نہ جانتا ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔

- اس میں وہ سارے علوم شامل ہیں جو فہم قرآن کی کلید ہیں جیسے اصول ترجمہ وتفسیر، ناسخ ومنسوخ کی بحثیں، آیاتِ احکام وغیرہ جنہیں 'علوم القرآن' کہا جاتا ہے۔

- اس میں ضمناً وہ سارے عقلی وتجربی علوم بھی شامل ہیں جن میں قرآن حکیم کی رہنمائی شامل ہو یعنی وہ قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کے مقاصد کے مطابق ہوں یا کم از کم اس کے خلاف نہ ہوں کیونکہ قرآن سب پر مہیمن ہے[1] اور ہر وہ بات قابل رد ہے جو اس کے خلاف ہو۔

تعلیمِ کتاب سے مقصود ہے انسانوں کی ہدایت۔

تعلیمِ حکمت

تعلیمِ حکمت سے مراد ہے عقلی وتجربی علوم (یعنی سوشل ونیچرل سائنسز)

- عقلی علوم میں سے انسانی اور سماجی علوم وہ ہیں جن میں قرآن حکیم کی بنیادی رہنمائی موجود ہے لیکن تفصیلی رہنمائی اللہ تعالیٰ نے عمداً، رحمۃً بالناس نازل نہیں فرمائی اور اسے امت کے اہل علم واجتہاد پر چھوڑ دیا کہ وہ اس بنیادی رہنمائی سے اخذ واستنباط کرتے ہوئے تفصیلی رہنمائی مہیا کریں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیاسی شعبے میں کچھ بنیادی اصول دیے ہیں لیکن تفصیلی سیاسی نظام نہیں دیا۔ اب یہ امت کے اہل علم واجتہاد کا کام ہے کہ وہ قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے حالات اور اپنی ضرورتوں کے مطابق تفصیلی سیاسی نظام تشکیل دیں۔ ظاہر ہے یہ تفصیلی سیاسی نظام ہر زمانے اور علاقے (Time and space) کے لحاظ سے بدلتا رہے گا اور اسے بدلنا چاہیے کیونکہ اس غیر منصوص حصے کا بدلنا فطری ہے اور اس پر جمود خلافِ شریعت ہے۔

- تجربی علوم سے ہماری مراد ہیں سائنس وٹیکنالوجی۔ یعنی وہ علوم وفنون جن میں اللہ

---

[1] الحشر ۵۹:۲۳

تعالیٰ نے رہنمائی کی ضرورت نہیں سمجھی اور اسے مکلفین/لوگوں کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنی عقل اور اپنے تجربے ومشاہدے سے ان کی صورت گری کرتے رہیں جیسے صنعت، تجارت، آلات حرب، میڈیسن، انجینئرنگ وغیرہ۔ اس کی مثال تابیر نخل کا مشہور واقعہ ہے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ "انتم اعلم فی امور دنیا کم"[1]

- تعلیم حکمت کا موضوع انسانی ہدایت نہیں بلکہ قطع اسباب اور استعمال وتسخیر کائنات ہے۔

غیر رسمی تعلیم

تعلیم سے مراد ہے باقاعدہ اور رسمی (Formal) تعلیم جو مدارس وجامعات میں دی جاتی ہے اور اس کے بعد اجازہ/ ڈگری دی جاتی ہے۔ اس کی غیر رسمی (Non formal) صورت وہ ہے جسے ہم دعوت وتبلیغ کہتے ہیں۔ وقت گزرنے اور تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ رسمی تعلیم آج کل اہمیت اختیار کر گئی ہے جب کہ ماضی میں رسمی تعلیم کم تھی اور دعوت وتبلیغ ہی کو تعلیم کی بنیادی شکل سمجھا جاتا تھا۔

تربیت

تربیت سے مراد ہے تعلیم کا متعلم کی شخصیت میں ڈھل جانا۔ طالب علم کا تعلیم کے اصولوں اور تقاضوں پر عمل کرنا یعنی تعلیم کا مطلب صرف جان لینا اور معلومات حاصل کر لینا نہیں بلکہ یہ ہے کہ طالب علم جو جان لے وہ اس پر عمل بھی کرے، وہ اس کی شخصیت وکردار کا حصہ بھی بن جائے۔

- تربیت، رسمی تعلیم کا ثمر اور حاصل ہوتی ہے۔
- غیر رسمی تعلیم بھی انسانی تربیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ غیر رسمی تعلیم کا ایک مظہر ہے

---

[1] صحیح مسلم: ۲۳۶۳

دعوت وتبلیغ۔اس کا نتیجہ بھی اصلاحِ نفس کی صورت میں نکلتا ہے اور نکلنا چاہیے۔اسی وجہ سے مسلم علمی روایت میں 'دعوت واصلاح' کی اصطلاح وجود میں آئی۔عصر حاضر میں غیر رسمی تعلیم کا ایک بڑا مظہر میڈیا (الیکٹرانک، پرنٹ اور سوشل میڈیا) ہے اور یہ بھی انسانی تربیت پر شدید طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ ''تربیت'' تعلیمی اصطلاح ہے۔'اصلاح' دعوتی اصطلاح ہے لیکن قرآنی اصطلاح 'تزکیہ' یعنی 'تزکیۂ نفس' ہے۔

تزکیۂ نفس سے مراد ہے دعوت وتعلیم کے نتیجے میں نفس انسانی یا انسانی شخصیت کی ایسی نمو کہ الٰہی ہدایت (یعنی الکتاب اور اس کے مقتضیات) پر عمل طالب علم کی طبیعت اور مزاج بن جائے، اس کی شخصیت کا لازمہ بن جائے۔تعلیماتِ شریعت پر عمل اس کے لیے آسان ہوجائے، یہ اس کے قوائے عقلی وجسمانی کا طبعی تقاضا بن جائے۔

تزکیہ کا لغوی معنی ہے پاک کرنا۔کسی چیز کی میل کچیل دور کرنا، اس کو صاف اور صیقل کرنا۔اس کی اضافت جب نفس انسانی کی طرف ہو تو اس کا مفہوم ہوگا نفس کو برے میلانات اور رجحانات سے بچانا، اسے تعمیری عادتیں ڈالنا، مفید رجحانات پروان چڑھانا۔ اور جب حسن وقبح، حق وباطل اور مفید ومضر کا معیار کتاب اللہ ہو تو اس کا مطلب ہوگا نفس کو ان باتوں اور کاموں سے روکنا جن سے کتاب اللہ روکتی ہے یعنی شریعت کے نواہی اور نفس کو ان کاموں کے کرنے کی ترغیب وتربیت دینا جن کے کرنے کا کتاب اللہ حکم دیتی ہے یعنی شریعت کے اوامر۔گویا تزکیۂ نفس کا مفہوم ومقصود یہ ہے کہ نفس کی ایسی تربیت کہ وہ کتاب اللہ کے اوامر پر عمل کرنے لگے اور اس کے بیان کردہ نواہی سے بچنے لگے۔

یاد رہے کہ تربیت یا تزکیۂ نفس کے تین درجے ہیں:

ایک: معصیت سے بچنا۔ظاہر ہے معصیت کا نتیجہ اللہ کو ناراض کرنا اور خود کو مستحق عذاب بنانا ہے۔لہٰذا تزکیۂ نفس کا پہلا اور ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ آدمی معصیت سے بچ

سکے۔

دوسرے: تزکیہ بالفرائض جونجات کے لیے کافی ہے جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک بدّو نے آپ ﷺ سے واجبات دین پوچھے تو آپ ﷺ نے اسے نماز پنجگانہ، زکوٰۃ، صیامِ رمضان اور حج کا بتایا تو اس نے کہا کہ وہ ان پر عمل کرے گا اور ان میں کمی بیشی نہ کرے گا۔ جب وہ چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر اس شخص نے ایسا ہی کیا جیسا اس نے کہا ہے تو وہ جنتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفس کا اتنا تزکیہ آخرت میں نجات کے لیے کافی ہے جس سے آدمی فرائض وواجبات پر قادر ہو سکے۔

تیسرے: اطاعت کا اعلیٰ درجہ تقرب الی اللہ کا ہے جو فرائض کے ساتھ کثرت نوافل اور طاعات غیر واجبہ کا تقاضا کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے ''احسان''[1] سے تعبیر کیا ہے۔ احسان کا مطلب ہے کارِ اطاعت اعلیٰ درجے میں سرانجام دینا۔ اسے انگریزی میں Par Excellence یا کسی کام کو State of the art انداز میں کرنا ہے۔ ایسے آدمی کو صرف جنت نہیں چاہیے ہوتی بلکہ جنت میں اعلیٰ درجہ کی تمنا ہوتی ہے۔ ایسا آدمی صرف کام ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں Perfection کا خواہاں بھی ہوتا ہے۔

تحقیق

اسلام صرف تحقیق کا نہیں بلکہ تخلیقی تحقیق (Creative Research) کا متقاضی ہے اور زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ زندگی کے سارے شعبوں میں۔ سطور بالا میں ہم نے اسلام کے فلسفۂ علم کے حوالے سے ذکر کیا تھا کہ اسلام میں علوم کی دو بڑی قسمیں ہیں ایک علوم نقلیہ اور دوسرے علوم عقلیہ۔ علوم نقلیہ کے دو حصے ہیں: ایک نصوص قرآن وسنت اور دوسرے علوم آلیہ۔ علوم عقلیہ کے بھی دو بڑے شعبے ہیں: ایک سماجی علوم اور دوسرے سائنسی علوم۔ اسلام میں تحقیق کے لحاظ سے تین بڑے دائرے ہیں:

---

[1] صحیح البخاری: ۵۰

۱۔ **نصوصِ قرآن وسنت:** ظاہر ہے قرآن وسنت کی نصوص ہمارے لیے مقدس، حتمی اور ناقابل تغیر (Untouchable) ہیں البتہ تحقیق کے اس میں بھی دو پہلو ہیں۔ یاد رہے کہ مسلم علمی روایت میں تحقیق اور عقلی استدلال کے استعمال کو ''اجتہاد'' کہتے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم اگرچہ نصوص کو نہیں چھیڑ سکتے تاہم ان میں اجتہاد کا دائرہ کار موجود ہے اور وہ دو پہلوؤں سے ہے: ایک نصوص کی تفہیم کے حوالے سے اور دوسرے ان کی تطبیق کے حوالے سے۔

۲۔ **علوم آلیہ وسماجی علوم:** یہ اسلام میں تحقیق واجتہاد کا دوسرا دائرہ ہے۔

علوم آلیہ میں جو فہم نصوص میں ہمارے مددگار ہیں، ہم عربی زبان کی مثال دیں گے جس میں مہارت کے بغیر نصوص قرآن وسنت کی تفہیم ممکن ہی نہیں۔ اب عربی زبان سیکھنا ناگزیر ہے لیکن عربی کیسے سیکھی جائے؟ ظاہر ہے یہ قرآن وسنت کی نصوص کا مسئلہ نہیں، عقل وتجربے کا مسئلہ ہے اور غیر عربوں (یعنی عجمیوں) کا عربی زبان سیکھنا تو بالکل ہی الگ فن ہے۔ ہم تلخیصاً عرض کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں صدیوں سے عربی زبان طریق قواعد (Grammar Method) سے سیکھی سکھائی جارہی ہے۔ اس کی اپنی خامیاں ہیں۔ پھر مغرب سے طریق مباشر (Direct Method) آیا اور آج کل طریق مباشر بھی پرانا ہوگیا ہے اور طریق مباشر اور طریق فطرت (Natural Method) کا مرکب یا ملغوبہ چل رہا ہے۔ اسی طرح عربی صوتیات کی نقل اور پریکٹس کے لیے معمل (Language Lab) کا طریقہ زیر استعمال ہے۔

علوم آلیہ میں تحقیق کی ایک اور مثال یہ ہے کہ نصوص قرآن حکیم روایت بالتواتر کی وجہ سے قطعی الثبوت ہیں لیکن احادیث رسول ﷺ کا معاملہ دوسرا ہے۔ انہیں قطعی الثبوت بنانے کے لیے محدثین نے علم روایت ایجاد کیا اور یوں اسناد، جرح وتعدیل اور اسماء الرجال کے علوم (Disciplines) وجود میں آئے۔

اس گروپ کا دوسرا اہم ترین شعبہ سماجی علوم کا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر گزر چکا کہ سماجی علوم کا تقریباً نصف قرآن وسنت کی ان ناقابل تغیر نصوص پر مشتمل ہے جو ہر سماجی علم میں بنیادی پالیسی رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔ باقی نصف اللہ تعالیٰ نے رحمۃً بالناس امت مسلمہ کے اہل علم واجتہاد کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ اپنے زمانے، معاشرے اور حالات کے مطابق تفصیلات کا تعین قرآن وسنت کی مذکورہ نصوص کی روشنی میں خود کرلیں۔

۳۔ **سائنس وٹیکنالوجی:** یہ عقلی علوم کا وہ شعبہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے عقل وتجربے کے لیے عمداً کھلا چھوڑا ہے اور اسے علم ہدایت کے دائرہ کار میں شامل نہیں کیا۔ زراعت، صنعت، طب، ہندسہ، فلکیات یعنی فزیکل اور نیچرل سائنسز اور ٹیکنالوجی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں تاہم سطور بالا میں ہم اسے قرآن وسنت سے ثابت کرچکے ہیں۔ کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾[البقرہ۲:۳۱] سے مراد علم کائنات ہے اور رسول اکرم ﷺ نے زراعت کے سلسلے میں انصاری کاشتکاروں سے کہا تھا کہ "انتم اعلم فی امور دنیاکم"[1] جس سے ظاہر ہے کہ یہ چیزیں لوگوں کے علم وتجربے پر چھوڑی گئی ہیں اور ان میں وحی الٰہی کی براہ راست مداخلت خالق کائنات نے مناسب نہیں سمجھی۔

تحقیق کی یہ بحث سمیٹنے سے پہلے ہم دو باتوں کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے:

ایک: یہ کہ درجۂ ''احسان''، جس کا ذکر ہم تزکیۂ نفس وتربیت میں کرچکے اس کا دائرۂ کار صرف امور تعبدیہ نہیں ہیں (جیسا کہ بعض لوگوں کو شبہ ہوا ہے) بلکہ زندگی کا ہر شعبہ ہے مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا کہ جانور کو ذبح کرنا ہو تو چھری اچھی طرح تیز کرلو۔[2] اسی طرح آپ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے، بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کرتے تھے اور اسی

---

[1] صحیح مسلم: ۲۳۶۳

[2] صحیح مسلم: ۵۰۵۵

کی اپنے صحابہ کرام کو تلقین کرتے تھے۔[1]

جب مسجد نبوی کی تعمیر ہورہی تھی تو ایک صاحب نے کہا کہ گارا میں بناتا ہوں۔ آپ ﷺ نے جب اس کام میں اس شخص کی مہارت دیکھی تو آپ ﷺ نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم لوگ دوسرے کام کرو، گارا انہی صاحب کو بنانے دو کہ یہ اس میں خوب مہارت رکھتے ہیں۔

دوسرے: یہ کہ گہرے ایمان، پختہ یقین اور اپنے نظریۂ حیات سے شدید وابستگی کے نتیجے میں جب فرد کی تعمیری عادات تشکیل پاتی ہیں اور ایک مضبوط شخصیت وجود میں آتی ہے تو اس کے نتیجے میں افراد میں وہ بنیادی انسانی اوصاف اور اہلیتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جو دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری ہیں۔ کسی تہذیب میں جب یہ جوہر سامنے آتا ہے تو یہ کسی ایک شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہتا۔ یعنی جب مسلمانوں میں یہ صفات ابھر کر سامنے آئیں تو یہ نہیں تھا کہ صرف ان کے اخلاق اچھے ہو گئے تھے، یا وہ عبادت گزار زیادہ ہو گئے تھے بلکہ آپ ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں Excell کر رہے تھے۔ فقہی اجتہاد میں بھی، سماجی علوم کی ترقی میں بھی اور سائنسی علوم کی ایجادات میں بھی۔ یعنی تحقیق و اجتہاد کا مادہ اور ایڈوانسمنٹ زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری تھی۔ اور جب زوال و اضمحلال آیا تو وہ بھی کسی ایک شعبے میں نہیں آیا بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آیا۔ دین پر عمل میں بھی، ترک اجتہاد کی صورت میں بھی، سماجی علوم کی عدم ترقی میں بھی اور سائنسی علوم وفنون میں پیچھے رہ جانے کی صورت میں بھی۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے زوال میں بنیادی کردار تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کے اصول پر صحیح سپرٹ میں عمل نہ کرنا تھا جس کی وجہ سے ایمان ضعیف ہوا، بنیادی انسانی صلاحیتیں مفقود ہوتی چلی گئیں اور علم وتحقیق کا زوال، عدم اجتہاد کا رویہ اور علوم حکمت میں

---

[1] موطا امام مالک: ۱۴۹۴

پسماندگی اس کا مظہر بن گئی۔

زوال کے خارجی اسباب

اگرچہ مسلم زوال کے سا باب بنیادی طور پر داخلی ہیں اور ان میں سے بھی بنیادی چیز تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس میں بگاڑ پیدا ہوجانا تھا....لیکن بہرحال اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے خارجی اسباب بھی تھے جن میں سے اہم تر مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ اور اس کے علمبردار ممالک کی اسلام اور مسلم دشمنی تھی۔ یہ دشمنی پرانی تھی۔ یہود ونصاریٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی شکستیں نہ بھولے تھے اور بس گھول رہے تھے۔ جونہی وہ انتقام لینے پر قادر ہوئے انہوں نے صلیبی جنگیں شروع کردیں اور ان کے مذہبی رہنماؤں نے مسلمانوں کے خلاف جھوٹا اور نفرت انگیز پروپیگنڈا کر کے مسیحی عوام اور حکمرانوں کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تعصب کی آگ بڑھکادی جس کی تپش آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔

انہوں نے مسلمانوں کو کمزور دیکھ کر ان کے خلاف سازشیں شروع کردیں خصوصاً آخری جنگ عظیم سے پہلے انہوں نے عربوں اور ترکوں کو ایک دوسرے سے لڑا کر سلطنت عثمانیہ کو کمزور کیا اور جنگ عظیم اوّل میں اتحادیوں نے جیتنے کے بعد مسلم علاقوں پر قبضہ کرلیا، ان کے مالی وسائل لوٹ لیے، انہیں کچلا اور غلام بنالیا۔

انہوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے ان کا نظام تعلیم ختم کردیا اور اپنے فکری وتہذیبی اصولوں پر نیا تعلیمی نظام بنا کر اپنے زیر قبضہ مسلمانوں پر بجبر مسلط کردیا۔ یوں گویا اہل یورپ نے بھی مسلمانوں کے ذہن کو بدلنے کے لیے تعلیم ہی کا سہارا لیا۔ اس کی کچھ تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

فصل سوم

تلاشِ راہ گزر (دورِ زوال میں برصغیر کے تعلیمی تجربات)

برصغیر میں زوالِ مسلم

برصغیر میں بھی مسلم زوال ایسے ہی آیا جیسے دوسرے مسلم ممالک میں۔ ہندوستان ایک بڑا ملک تھا۔ مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہاں جو مسلمان ہوئے زیادہ تر صوفیاء کے ذریعے۔ اور مسلم حکمرانوں (خلجی، تغلق، مملوک، غزنوی، غوری) نے یہاں اشاعت وغلبۂ اسلام کے لیے کبھی زیادہ کوششیں نہیں کیں۔ اورنگ زیب کے بعد مغلوں کا زوال شروع ہوگیا۔ ہندوستان چونکہ معاشی طور پر خوش حال تھا اس لیے جب یورپی قوموں نے انگڑائی لی اور تجارت کے لیے بحری اسفار شروع کیے تو پہلے پرتگیزوں، پھر ولندیزیوں اور پھر برطانویوں (انگریزوں) نے ابتداءً یہاں تجارتی کوٹھیاں قائم کیں اور پھر کمزور مسلمان حکمرانوں کو سازشوں سے باہم لڑا کر یا ان کے جرنیلوں کو رشوت سے خرید کر یا ہندوؤں (مرہٹے، گورکھے) کو مسلمانوں سے لڑا کر مسلم ریاستوں پر قابض ہوتے چلے گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے، جو ایک برطانوی تجارتی کمپنی تھی، پرائیویٹ فوج بنا کر اور مقامی قوتوں کو ساتھ ملا کر ہندوستان کے ایک بڑے علاقے پر حکومت قائم کرلی۔ مسلمانوں نے بغاوت کی آخری بڑی کوشش ۱۸۵۷ء میں کی، جو ناکام ہوئی اور کچل دی گئی اور تاج برطانیہ نے براہ راست ملک پر قبضہ کرلیا۔

انگریزوں نے سیاسی، حربی، معاشی غلبے کے ساتھ مسلمانانِ ہند پر فکری اور مذہبی غلبے کے لیے بھی کوششیں شروع کردیں تاکہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام رکھا جاسکے۔ چنانچہ پادریوں کی فوج ظفر موج نے برصغیر پر یلغار کردی لیکن علماء اسلام علمی سطح پر اپنے دین کی مدافعت کرنے میں کامیاب رہے۔ اس پر انگریزوں نے مسلمانوں کو اندر سے توڑنے کی

کوشش کی اور ایک جھوٹا نبی مسلمانوں میں کھڑا کر دیا جس نے انگریز کے خلاف مزاحمت (جہاد) کو منسوخ کرنے کا علان کر دیا۔ دوسری بڑی کوشش انہوں نے تعلیم کے ذریعے کی اور ۱۸۳۲ء میں اپنے دانشور بیوروکریٹ (لارڈ میکالے) کی تعلیمی رپورٹ منظور کر لی جس کا لب لباب اقبال کے لفظوں میں یہ تھا کہ ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

لارڈ میکالے کی رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اگر اپنا مذہب نہیں بدلتے تو نہ سہی، ان کا تعلیمی نظام اس طرح بدل دو کہ یہ تمہاری فکر و تہذیب کے گن گانے لگیں اور اس کی پیروی کے سوا انہیں کچھ سوجھے ہی نہیں، خواہ نام ان کے مسلمانوں جیسے رہیں۔ اس کے لیے بھرپور منصوبہ بندی کی گئی۔ مسلم اوقاف ختم کر دیئے گئے، ذریعۂ تعلیم فارسی کی بجائے انگریزی کر دیا گیا اور اسے حصول ملازمت کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا۔ اس زمانے میں یہ محاورہ ایجاد ہوا کہ ''پڑھیں فارسی بیچیں تیل'' یعنی جو فارسی پڑھیں گے (جو اس وقت قومی اور سرکاری زبان تھی) وہ نمک ہی بیچیں گے (یعنی روزی روٹی کے لیے کریانے کی دکان ہی کر سکیں گے، سرکاری ملازمت انہیں نہیں ملے گی)۔

اس موقع پر تعلیمی لحاظ سے گویا ایک ایمرجنسی کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مسلم نظام تعلیم اوقاف (وقف جسے انگریزی میں Endowment/Trost کہتے ہیں) پر مبنی تھا اور علماء کرام کے ہاتھ میں تھا۔ حکومت ختم ہو جانے اور اوقاف کے خاتمے سے وہ نظام تعلیم یک دم بیٹھ گیا۔ علماء فارغ ہو گئے۔ اس صورت حال کے ردّعمل میں دو فکری اور تعلیمی تحریکیں ابھریں: ایک دیوبند کی اور دوسری علی گڑھ کی۔

علی گڑھ

مغرب اور اس کی فکر سے مرعوب تعلیمی تحریک جس نے یہ سمجھا کہ مغرب نے علوم میں

جو ترقی کی ہے وہی ان کی دنیا میں کامیابی، تفوق اور غلبے کی وجہ ہے۔ لہٰذا ہم بھی اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے بہترین طرزِ عمل یہ ہے کہ ہم تعلیم اور علوم میں مغربی روش کی پیروی کریں۔ یہ تعلیمی تحریک وہ ہے جس کی بناء سرسید احمد خاں نے رکھی جو انگریز حکومت میں سرکاری ملازم تھے اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی یا انگریزوں کے خلاف بغاوت میں، جسے انگریز اور اس کے حمایتی جہاد کی بجائے 'غدر' (یعنی جائز اور قانونی حکومت کی رِٹ نہ مان کر غداری کا مرتکب ہونا) کہتے تھے، انہوں نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائی تھیں اور برطانوی حکومت کی حمایت کی تھی۔

اگرچہ سرسید نے انگریز حکومت سے مدد بھی لی بلکہ اس کی اشیر باد سے ہی علی گڑھ کالج قائم کیا اور اس کے اکثر پروفیسر اور صدور شعبہ انگریز تھے لیکن انہوں نے اسے مقامی تعلیمی تحریک بھی بنایا۔ کالج کے قیام کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے کی خاطر انہوں نے سارے ملک کا دورہ کیا اور اور عوام کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے علی گڑھ (اس وقت دارالعلوم/کالج) میں دینیات کا شعبہ بھی قائم کیا اور علامہ شبلی نعمانی جیسے عالم کو اس کا سربراہ مقرر کیا۔ تاہم اسلام اور تہذیب مغرب کے ادغام وانسجام کا یہ تجربہ ان کی زندگی ہی میں ناکام ہوگیا جب شبلی نے کالج میں مغربیت کے ماحول کا غلبہ اور اسلامی علوم واقدار کی مغلوبیت دیکھ کر اور سرسید کے تجدد سے بیزار ہو کر کالج سے استعفیٰ دے دیا اور سید کے اپنے بیٹے سید محمود کی علانیہ شراب نوشی اور اسلامی اقدار کی استہزاء کی عادت نے ان کو رسوا کیا یہاں تک کہ اس نے سرسید کے بڑھاپے، بیماری اور ضعف کا بھی لحاظ نہ کیا اور انہیں گھر سے نکال دیا۔ یہاں تک کہ سرسید کی وفات بھی ایک دوست کے گھر ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند

دوسری فکری اور تعلیمی تحریک روایتی علماء کرام کے ردِّعمل پر مبنی تھی جو انگریز کو کافر اور اس کی تہذیب کو کفر سمجھتے تھے اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری اداروں میں ملازمت

کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے یہ دیکھ کر کہ اگر حالات یہی رہے تو ہندوستان اندلس بن جائے گا اور یہاں سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جائے گا، انہوں نے مسجد میں بیٹھ کر، بلا کسی معاوضے اور تنخواہ کے، بنیادی دینی علوم (قرآن، حدیث، فقہ، عربی زبان وغیرہ) کی تعلیم بچوں کو دینا شروع کی تا کہ مسلمانوں کی مسجدیں امام نہ ہونے کی وجہ سے بند نہ ہوں اور کوئی تو ہو جو ان کے نکاح اور جنازے پڑھا سکے اور کم از کم انفرادی اور عائلی زندگی کی اسلامی تناظر میں بقاء کی صورت بن سکے۔ اس طرح ایک عالم مسجد میں یا اس کے ساتھ بنے ہوئے مٹی کے حجرے میں بچوں کو دین پڑھاتا اور پیٹ بھرنے کے لیے مسلمانوں کے گھروں سے روٹی مانگ کر کھا لیتا۔ اس نقطۂ نظر کے حامیوں نے ۱۸۶۶ء میں دیوبند شہر میں پہلا دینی مدرسہ قائم کیا جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے نام سے مشہور ہوا۔

دو متوازی تعلیمی دھارے

اس طرح مسلم برصغیر میں مسلمانوں کے دو متوازی تعلیمی دھارے وجود میں آ گئے۔ ایک میں تعلیم مغرب زدہ تھی، مغرب کے نظام فکر اور نظام تعلیم کی نقالی پر مبنی تھی۔ اس میں مذہبی تعلیم وتربیت برائے نام تھی اور جو عمرانی اور سائنسی علوم اس میں پڑھائے جاتے تھے وہ بھی مغرب کے بنیادی افکار (ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، میٹریلزم وغیرہ)، مغرب کے ورلڈ ویو (خدا، رسول، آخرت کی نفی) اور مغرب کے فلسفۂ علم (وحی کی سیادت کا انکار اور انسانی عقل وتجربے کے حتمی ہونے) پر مبنی تھے اور یہ طلبہ کو مغربی فکر وتہذیب کے صحیح وبرحق ہونے اور اس کی بالادستی وغلبے کو قبول کرنے اور اور اس کی روشنی میں اسلام کو سمجھنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ علی گڑھ کا رول ماڈل تھا۔

دوسری طرف مذہبی تعلیم تھی جس میں صرف دینیاتی علوم پڑھائے جاتے تھے اور عمرانی وسائنسی علوم کی تدریس کا وہاں گزر نہ تھا اور جو علوم پڑھائے جاتے تھے وہ بھی صدیوں پرانے تھے۔ دنیاوی یا عصری علوم نہ پڑھانے کا ان کے پاس عذر یہ تھا کہ ریاست کے

لیے کارکن تیار کرنا ان کے پیش نظر نہ تھا کیونکہ وہ انگریز کو استعمار سمجھتے تھے اور ان کا نظام حکومت چلانے کے لیے کارکن تیار کرنا گویا ان کی آئینی حیثیت کو تسلیم کرنا اور ملک کے چلانے میں ان کی معاونت کرنا تھا اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ انہیں انگریز کے لیے کارکن تیار نہیں کرنے لہٰذا وہ اگر اپنے طلبہ کو انگریزی اور معاصر علوم نہیں پڑھاتے تو وہ اس میں حق بجانب ہیں۔

تاہم، اس کے باوجود دونوں گروہوں کو اپنی کمزوری اور خامی کا احساس تھا اور وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کا منہج تعلیم یک رخا ہے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی رقم طراز ہیں کہ دیوبند کے فکری بانی مولانا رشید احمد گنگوہی کہا کرتے تھے کہ یونانیوں کا فلسفہ اور منطق پڑھانے کی بجائے طلبہ کو انگریزی پڑھا دینی چاہیے کہ ان کی دنیا کے کام آئے۔[1] اور دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بحری جہاز کے ذریعے حج سے واپسی پر جہاز کے انگریز کپتان سے علمی مباحثہ ہوا جس میں انہیں مترجم کے ذریعے دین وحکمت کے حقائق اسے بتانے پڑے تو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ واپس وطن پہنچ کر انگریزی ضرور سیکھیں گے لیکن جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا اور زندگی نے انہیں اس کی مہلت نہ دی۔[2]

تاہم ان کے اولین شاگرد اور ان کے بعد دیوبند کے علمی سربراہ شیخ الہند مولانا محمود حسن چاہتے تھے کہ ان کے مدرسہ کے طالب علم عصری علوم سے بھی واقف ہوں۔ دوسری طرف علی گڑھ والوں کو بھی احساس تھا کہ وہ دینی تعلیم وتربیت میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ چنانچہ دیوبند اور علی گڑھ میں یہ معاہدہ ہوا کہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ دوسال کے لیے علی گڑھ میں پڑھیں گے اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ دوسال دیوبند میں پڑھیں گے۔ اس معاہدے پر عمل درآمد بھی شروع ہوگیا اور علی گڑھ کا پہلا گروپ دوسال کے لیے دیوبند آ گیا

---

[1] مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، جلد ۲، صفحہ ۲۹۲

[2] مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، جلد ۲، صفحہ ۲۹۹

لیکن بدقسمتی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ہمارا خیال ہے کہ بات گول مول کرنے کی بجائے اس واقعے کا ذکر کر ہی دینا چاہیے جو اس معاہدے کے انقطاع کا سبب بنا اور وہ یہ تھا کہ طلبہ کا جو پہلا گروپ علی گڑھ سے دیوبند پڑھنے آیا ان میں سے ایک سی آئی ڈی ایجنٹ تھا جو اپنی بعض حرکتوں کی وجہ سے پکڑا گیا اور دیوبند سے علی گڑھ کے طلبہ کے اخراج کا سبب بنا۔ ظاہر ہے اس واقعے کے پیچھے بھی انگریز استعمار کی سازش تھی چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ نہ صرف علی گڑھ کے قیام کا سبب مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت اور اس کی نقالی کی خواہش تھی اور نہ صرف دیوبند کا قیام انگریزی استعمار کی تعلیمی پالیسیوں کے ردّ عمل کا نتیجہ تھا بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں تعلیمی دھاروں کی قریب آنے کی خواہش اور اس تعلیمی ثنویت کی خلیج کے پاٹنے کی خواہش کا گلا گھونٹنے کی ذمہ دار بھی انگریز کی استعماری حکومت تھی۔

دیوبند اور علی گڑھ میں قربت کی کوششوں کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں مسلم زعماء تعلیمی ثنویت کے نقصانات سے بچنے کے طریقوں پر غور کرتے رہے۔ اس غور وفکر کا حاصل ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کا قیام تھا۔

ندوۃ العلماء کا قیام

علی گڑھ مغربیت کی جس روش پر چل نکلا تھا اور اسلامی تعلیم وتربیت سے وہاں جس طرح صَرف نظر ہوا اور دیوبند نے جس طرح 'دین کی تعلیم' کو صرف چند خالص دینیاتی مضامین تک محدود کرلیا تھا، مولانا محمد علی مونگیری اور ان کے ساتھیوں نے لکھنؤ میں ایک نئے تعلیمی ادارے کے قیام کا خواب دیکھا جو 'ندوۃ العلماء' کے نام سے متعارف ہوا اور جس میں انہوں نے علی گڑھ سے مایوس ہوکر اسے چھوڑنے والے علامہ شبلی کو بھی ساتھ ملالیا۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جو تعلیمی ثنویت قائم ہوچکی تھی، اس کے پاٹنے کے عملی طریقے دو ہی ممکن تھے (اور آج بھی ہیں) ایک یہ کہ ایک رول ماڈل دینی مدرسہ قائم کیا

جائے جس میں دیوبند والی خامیاں نہ ہوں اور جس میں علی گڑھ والی کچھ خوبیاں ہوں اور جب ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک اس نئے مدرسہ کی تکمیل ہوجائے تو وہ قدیم وجدید یا دینی تعلیم اور عصری تعلیم دونوں کا جامع ہو، گو اس کا بنیادی تخصص دینی تعلیم ہی رہے۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ بارہ سو سال تک جو نظام تعلیم مسلم معاشرے میں رائج رہا ہے وہ دین ودنیا بلکہ صحیح تر لفظوں میں دنیا وآخرت سے متعلق دونوں طرح کے علوم کا جامع تھا۔ اس میں دینی ودنیاوی تعلیم الگ الگ نہ تھی بلکہ نظام تعلیم موحّد (Integrated) تھا۔ اگرچہ اس میں تخصص (Specialization) کا اتنا واضح تصور موجود نہ تھا، جتنا مغرب میں آج ہے۔ بلکہ عمومی تعلیم کے بعد جو لوگ جن علوم میں مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے، وہ اس شعبے سے متعلق علم کے ماہر استاد کے پاس یا اس کے قائم کردہ مدرسہ میں چلے جاتے تھے خواہ وہ دین کا علم ہو یا طب کا اور فلسفے کا علم ہو یا فلکیات کا۔

اسی طرح یہ بھی ذہن میں رہے کہ ملا نظام الدین سہالویؒ نے ۱۷۴۸ء میں جو درس نظامی تشکیل دیا تھا وہ بھی جنرل ایجوکیشن یا عمومی تعلیم کا نظام تھا نہ کہ صرف دینی علوم کے ماہرین تیار کرنے کا۔ یعنی وہ معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن (بیوروکریٹس) بھی تیار کرتا تھا نہ کہ محض مسجد اور مدرسہ کے لیے علماء تیار کرنا تھا۔ اس نظام تعلیم میں جو مضامین پڑھائے جاتے تھے، ان میں نقلی علوم میں قرآن وسنت کے علوم کی ایک ایک کتاب تھی اور باقی علوم دنیاوی، عصری یا عمومی تعلیم کے تھے۔[1]

تعلیمی ثنویت کے خاتمے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ایک جدید عصری تعلیم کا ادارہ قائم کیا جائے جس میں علی گڑھ والی خامیاں نہ ہوں اور دیوبند والی بعض بنیادی خوبیاں اس میں موجود ہوں۔ اس طرح کا جدید تعلیم کا نیا رول ماڈل ادارہ جب پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ایک شکل اختیار کرلے گا تو وہ جدید وقدیم یا دینی ودنیاوی علوم کا جامع ادارہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' صفحہ ۷۲)

ہوگا۔ وہ عصری علوم کے میجر (Major) کے ساتھ دینی تعلیم وتربیت (بطور سب میجر) رکھنے والا ادارہ ہوگا جس میں دینی ودنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دی جائے گی۔ اس میں دنیوی علوم کے ماہرین کے ساتھ علوم اسلامیہ میں تخصص رکھنے والے علماء وسکالرز بھی ہوں گے)۔ اس طرح یہ ادارہ ثنویت سے پاک ہوگا۔

خیر یہ باتیں بطور (طویل) جملہ معترضہ کہہ دی گئیں ورنہ ہم بات یہ کررہے تھے کہ مولانا محمد علی مونگیری اور ان کے ہم خیال لوگوں نے لکھنؤ میں دینی تعلیم کا ایک ایسا ادارہ قائم کرنا چاہا جو تخصص تو اگرچہ دینی تعلیم کا رکھتا ہو لیکن اس کے ہاں دیوبند والی روایت پسندی یا جمود (Rigidity) نہ ہو بلکہ اس میں انگریزی بھی پڑھائی جائے اور جدید علوم کا تعارفی مطالعہ بھی کرایا جائے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ دیوبند والوں نے ملا نظام الدین سہالویؒ والا درس نظامی سارے کا سارا نہیں لیا تھا بلکہ اس کے مضامین میں سے کچھ کا انتخاب کرلیا تھا۔ اسی طرح ندوۃ العلماء نے وہ نصاب سو فیصد نہیں لیا جو دیوبند میں رائج تھا بلکہ انہوں نے دینی مضامین کا اپنا ایک انتخاب کیا۔

ندوۃ العلماء قائم کرنے والوں کی نیت نیک تھی اور مشن عظیم تھا لیکن جیسا کہ انسانی خواہشوں اور کاوشوں کا حشر ہوتا ہے کہ آدمی (ایک ہو یا چند ہم خیال) جو خواب جس طرح دیکھتا ہے وہ اس طرح پورا نہیں ہوتا۔ علامہ شبلی بھی ندوہ کے ساتھ یکسوئی سے نہ چل سکے اور آخر میں ندوۃ المصنفین کے ہو کر رہ گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ندوہ وہ تو نہ بن سکا جو اس کے بنانے والوں کا تخیل تھا، تاہم وہ دیوبند سے الگ اپنا تشخص بنانے میں کامیاب ہوگیا جو دیوبند سے مختلف تھا۔ وہاں کے فارغ التحصیل علماء عربی ادب کے علاوہ فنکشنل عربی (بول چال وتحریر) میں مہارت رکھنے والے ہوتے۔ یوں ندوۃ عربیت کی طرف لڑھک گیا، اگرچہ وہ دین کے عالم بھی ہوتے اور مزید علوم کے جاننے والے بھی۔ شبلی کے بعد ان کے تلمیذ خاص سید سلیمان ندویؒ نے اس رنگ کو جمانے میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے بعد سید

ابوالحسن علی ندویؒ نے۔ یوں ندوہ ثنویت کے خاتمے کا اعزاز تو حاصل نہ کرسکا لیکن دیوبند کی روایت پسندی سے بہرحال آگے نکل گیا اور برصغیر کی علمی اور دینی زندگی پر بلاشبہ اس کے تعمیری نقوش ثبت ہیں اور وہ آج بھی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

جامعہ ملیہ

علی گڑھ میں دنیاوی علوم کی اسلامی تناظر میں عدم تدریس، جدید تعلیم کے اسلامی اقدار وروایات پر عمل نہ کرنے اور برصغیر کے مسلم مفادات کی آبیاری نہ کرنے کی وجہ سے برصغیر کی مسلم قیادت میں ایک عمومی بے چینی پیدا ہوئی اور علی گڑھ سے ناراضی اور توحش نے قومی قیادت کو مجبور کیا کہ ایک نئی مسلم یونیورسٹی کے قیام پر غور کیا جائے۔ چنانچہ مسلم قومی قائدین جیسے مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ ہی میں جمع ہوئے اور انہوں نے 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' (یعنی ملت کی اسلامی یونیورسٹی) کے نام سے ایک نئی یونیورسٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے افتتاحی اجلاس میں مدرسہ دیوبند کے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی شریک ہوئے۔ انہوں نے اس موقع پر دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ جب مَیں نے یہ دیکھا کہ میرے درد کو سمجھنے والے دینی مدرسوں سے زیادہ جدید تعلیمی اداروں میں موجود ہیں تو مَیں نے مناسب سمجھا کہ میں خود ان کی طرف قدم بڑھاؤں اور اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کروں جو عصری تعلیم کے اداروں اور دینی مدارس میں پیدا ہوگئی ہے۔[1]

جامعہ ملیہ کا افتتاح علی گڑھ میں ہوا تھا لیکن ۱۹۲۵ء میں وہ دہلی منتقل ہوگئی۔ یہ جامعہ تعلیمی ثنویت کے خاتمے اور جدید عصری تعلیم کو اسلامی تناظر دینے میں زیادہ کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ اس کی قیادت جلد ہی (اسلامی کی بجائے) قوم پرستی کے قائل ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جنہوں نے برصغیر کے اہم قومی مسائل جیسے تحریک پاکستان اور دو

[1] مولانا محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد ۱، صفحہ ۳۷۱

قومی نظریہ میں بھی پاپولر مسلم فکر کا ساتھ نہ دیا۔ مالی طور پر بھی یہ مستحکم نہ ہوسکی کیونکہ اس کا انحصار مسلمانوں کے چندوں پر تھا اور مسلمان عوام نے اسے اس طرح صدقات وعطیات نہ دیے جس طرح وہ دینی مدارس کو ایک دینی کام اور کارِ ثواب سمجھ کر دیتے تھے۔ انگریز حکومت نے بھی اس کی سرپرستی نہ کی (جس طرح اس نے علی گڑھ کی کی تھی) لہٰذا یہ تقسیم ملک تک کسی نہ کسی طرح زندہ رہی اور اس کے بعد حکومت ہند نے اسے قومی یونیورسٹی قرار دے دیا۔ اور آج اسلامی نہ سہی مسلم مفادات کے تحفظ کے لحاظ سے بھی اس کا وہ درجہ نہیں جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جامعہ ملیہ دہلی تعلیمی ثنویت کے خاتمے اور مسلم تصورِ تعلیم کے مطابق موحد نظامِ تعلیم کے احیاء کے لیے کوئی زیادہ کام نہ کرسکی۔ بلکہ اس سلسلے میں جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) نے شاندار کام کیا اور اردو کو بنیاد بنا کر (جو برصغیر میں مسلمانوں کی زبان تھی) مغربی علوم کے انگریزی سے اردو میں تراجم کا وسیع سلسلہ شروع کیا لیکن تقسیم ملک نے اس کا بھی خاتمہ کردیا۔ دورِ غلامی میں انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی اداروں، اسلامیہ کالج پشاور، زمیندار کالج گجرات وغیرہ نے مسلمانوں کے قومی تعلیمی اداروں کی حیثیت سے اس لحاظ سے کچھ بہتر کام کیا کہ یہ مغرب زدگی میں علی گڑھ سے کچھ کم تھے اور انہوں نے مسلم طلبہ کو تعلیمی خدمات مہیا کیں لیکن یہ بہرحال ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انہوں نے تعلیمی ثنویت کے خاتمے، دنیاوی علوم کی اسلامی تناظر میں تدریس، اسلامی تربیت اور اسلامی تحقیق میں کوئی خاص پیش رفت نہ کی۔

حال

باب دوم

پاکستان میں تعلیم کی موجودہ صورتِ حال

فصل اوّل: جدید تعلیم
فصل دوم: دینی مدارس کی تعلیم
فصل سوم: اصلاحی کوششیں

دوقومی نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک چلی تھی اور جس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا تھا، اس کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ تھا کہ پاکستان کو ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست بنایا جاتا کیونکہ دوقومی نظریہ اسلام کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان اپنے عقیدے، اپنی تہذیب اور اپنے طرز حیات کے سبب ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم ہیں اور انہیں الگ وطن کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بنیاد پر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں ان کی الگ ریاست بننی چاہیے جہاں وہ اپنے عقیدے اور اپنی تہذیب وثقافت کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرسکیں[1]۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اسی نظریے کے مطابق تحریک پاکستان کی قیادت کی۔ انہوں نے بارہا کہا کہ پاکستان کا دستور قرآن ہوگا اور پاکستان اسلام کی تجربہ ہوگا[2] اور پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگا جہاں لوگ اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزاریں گے[3]۔ پھر مسلمانوں نے تقسیم ملک کے وقت بے پناہ قربانیاں دیں۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہزاروں مسلمان قتل کردیے گئے، ہزاروں گھر جلادیے گئے۔ ہزاروں مسلمان لڑکیاں عصمت سے محروم ہوگئیں۔ سیکڑوں عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں کود گئیں اور بعضوں کو زبردستی سکھوں اور ہندوؤں نے اپنے گھروں میں ڈال لیا۔ اکثر مہاجرین لٹے پٹے صرف جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور وہ پاکستان کی سرزمین کو چھوتے ہی سجدہ ریز ہوجاتے اور اللہ کا شکر بجالاتے۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ پاکستان بنتے ہی معاشرے اور ریاست کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا کام زور وشور سے شروع کردیا جاتا لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ایسا نہ ہوسکا۔ قائداعظم جو بیمار اور بوڑھے تھے قیام پاکستان کے بعد جلد ہی راہیٔ ملک عدم ہوئے اور باقی

---

[1] Speeches and Statements of Iqbal, p-3, Lahore, 1948

[2] آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ 15 نومبر 1942ء سے خطاب

[3] 17 ستمبر 1944ء کو گاندھی کے نام خط

بچنے والی قیادت میں وہ اسلامی سیرت اور جذبہ موجود نہ تھا اور قائداعظمؒ سے یہ فقرہ منسوب کیا جاتا ہے کہ ''مجھے معلوم نہ تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔''

قائداعظم کی آنکھیں موندتے ہی لیگی قیادت اور حکومت مغربی فکر وتہذیب اور مغرب کے سیاسی نظام کے اتباع میں لگ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب تہذیب کا مقابلہ کرنا اور وقت کی مخالف رو میں چلنا آسان نہیں ہوتا۔ کانگرسی علماء کو چھوڑ کر جو اپنے موقف کے مطابق تقسیم ہند کے خلاف تھے اور اس کے لیے سیاسی اور مذہبی دلائل رکھتے تھے، غیر جانبدار اور سنجیدہ علماء مثلاً مولانا مودودیؒ دوقومی نظریے کی حمایت تو ضرور کرتے تھے لیکن مسلم لیگ کا جو مزاج اور سیاسی ڈھانچہ تھا، اس کے پیش نظر وہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ مسلم لیگ پاکستان کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنا سکے گی۔ چنانچہ یہ لوگ اقتدار میں آکر زمینیں اور مکان الاٹ کرانے میں لگ گئے اور پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ اور قلعہ بنانے کا خواب ہوا میں بکھرنے لگا۔ قائداعظم کی ایماء پر علامہ اسد کو اداروں کی تشکیل نو کا جو کام سونپا گیا تھا اور مولانا مودودیؒ ریڈیو پاکستان سے اسلامی نظام حیات پر جو تقریریں نشر کر رہے تھے، قائداعظم کی رحلت کے بعد علامہ محمد اسدؒ ملک چھوڑ کر چلے گئے اور مولانا مودودیؒ سے اسلامی نظام حیات پر تقریریں کرانے کی بجائے (اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے پر) انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

چونکہ اس موضوع پر تفصیل میں جانا ہمارے پیش نظر نہیں لہٰذا ہم وہ بات کہتے ہیں جس کے لیے ہم نے یہ تمہید باندھی تھی اور وہ یہ کہ علامہ اقبال کے خواب اور قائداعظم کی تصریحات کا تقاضا یہ تھا کہ:

ا۔ پاکستانی معاشرے اور ریاست کے ایک ایک شعبے کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کی جاتی مثلاً یہ سوچا جاتا کہ پاکستان کے معاشی نظام کو اسلامی بنیادوں پر کیسے استوار کیا جائے اور اس کے لیے انگریز سے مستعار اور اس کے قائم کردہ معاشی ڈھانچے میں کیا بنیادی اور

انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ یہی کام سیاسی نظام کے حوالے سے، عدالتی نظام کے حوالے سے، معاشرتی نظام کے حوالے سے کیا جاتا۔ ظاہر ہے اس کام میں علماء کرام اور دینی عناصر سے مدد لینا پڑتی۔ یہ کام مشکل ضرور تھا لیکن اگر پاکستانی اشرافیہ (اسٹیبلشمنٹ) اخلاص سے یہ کام کرنا چاہتی تو ناممکن بھی نہیں تھا۔ دراصل اس کے لیے جو چیز درکار تھی وہ ایمان اور سیاسی عزم (Political Will) تھا جو مفقود تھا چنانچہ بدقسمتی سے صحیح سمت میں کام شروع ہی نہیں ہوا۔

۲۔ اگر پاکستان میں اداروں کی اسلامی تشکیل نو کا کام شروع ہوتا تو غالباً سب سے زیادہ اہم اور دوررس اثرات کا حامل جو شعبہ تھا وہ تعلیم کا شعبہ تھا کیونکہ تعلیم ہی وہ شعبہ ہے جو انسانوں کی ذہنی سازی کرتا ہے، سیرتوں کی تعمیر کرتا ہے اور وہ لوگ تیار اور پیدا کرتا ہے جو معاشرے کو کسی خاص ڈھب پر چلانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ شعبہ صحیح رُخ میں کام کرتا تو اس کے چار بڑے تقاضے تھے:

i۔ استعمار نے تعلیم کو اپنے مقاصد (یعنی مسلمانوں میں فکری غلامی پیدا کرنے کے لیے، انہیں اپنی تہذیب کا شائق بنانے کے لیے اور اپنی حکومت چلانے کے لیے کل پرزوں کے طور پر استعمال کرنے کے لیے) جس رُخ پر ڈھالا تھا، اس کی شعوری طور پر نفی کی جاتی۔

ii۔ اس پر غور کیا جاتا کہ مسلمانوں کو حالت غلامی اور اس کے اثراتِ بد سے نکالنے اور عظمت گم گشتہ کے حصول اور نشأۃ ثانیہ کے لیے تعلیم کو کیا رُخ دینا مطلوب ہے۔

iii۔ استعماری تعلیمی پالیسیوں نے مسلم تعلیم کو دو دھڑوں میں تقسیم کر کے اسے ثنویت کی راہ پر ڈال دیا تھا، اس ثنویت سے جان چھڑائی جاتی۔

iv۔ مسلمانوں کی عمومی تعلیم جسے عصری اور جدید تعلیم بھی کہا جاتا ہے، اس کا سارا فکری اور تنظیمی ڈھانچہ مغرب زدہ تھا (جس کا رول ماڈل علی گڑھ یونیورسٹی تھی)۔ اس پر مغرب کے اثرات ختم کر کے اسے اسلامی بنیادوں پر استوار کرنا پاکستانی تعلیم کا ایک فوری

تقاضا تھا۔

v۔ دینی مدارس کا نظام تعلیم (جس کا رول ماڈل دیوبند تھا) دین کا ناقص تصور رکھتا تھا یا دور غلامی کی مجبوریوں کی پیداوار تھا یا کہا جاسکتا ہے کہ دور غلامی میں عارضی/ وقتی طور پر (بطور Stop-Gap Arrangement) اختیار کیا گیا تھا تا کہ انگریزوں کے مسلم نظام تعلیم کو ختم کرنے سے ہونے والے خلا کو پُر کیا جاسکتا۔ یہ نظام تعلیم انگریزی استعمار کے ردّ عمل کی پیداوار تھا۔ علماء ظاہر ہے انگریز سے نفرت کرتے تھے اور انہیں اس کی حکومت کے لیے کل پرزے تیار نہیں کرنے تھے لہٰذا انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم پڑھانے سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

پاکستان بننے کے بعد اس صورت حال میں ایک بنیادی تبدیلی آئی کہ اب ریاست وحکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، خواہ وہ جیسے کیسے بھی تھے۔ لہٰذا اب علماء کرام کو چاہیے تھا کہ اپنے نظام تعلیم کو بدلتے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔

ان تقاضوں کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں نظام تعلیم کی ان تقاضوں کے مطابق تشکیل نو ہونا چاہیے تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اس کے برعکس عملاً ہو کیا رہا ہے، اس کی مختصر سرگزشت درج ذیل ہے:

مبحث اوّل: جدید تعلیم

پاکستان میں تعلیم کا مرکزی دھارا وہ ہے جسے جدید تعلیم، عمومی تعلیم یا عصری تعلیم کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ تعلیم جو عام پاکستانی طلبہ وطالبات حاصل کرتے ہیں، سوائے دینی مدارس کے بچوں کے (بلکہ دینی مدارس کے بچے بھی ابتداءً یہی تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ دینی مدارس عموماً مڈل یا میٹرک پاس بچے لیتے ہیں اور درس نظامی کے بعد بھی وہ جدید تعلیم سے مستفید ہوتے ہیں کیونکہ مدارس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا انتظام نہیں ہوتا۔)

اس جدید تعلیم سے فارغ ہونے والے بچے معاشرے اور ریاست کے مختلف شعبے اور

ادارے چلاتے ہیں۔ پولیس، فوج، عدلیہ، انتظامیہ، مقننہ چلانے والے افراد اسی نظام تعلیم سے آگے آتے ہیں (سوائے چند افراد کے جو بطور استثنیٰ دینی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم بھی حاصل کر لیتے ہیں اور معاشرے یا ریاست کے کسی شعبے میں بھی چلے جاتے ہیں)۔ اب عنوان بنا کر تفصیل دینے کی بجائے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ تعلیم کے اہم نکات کا ہم نمبر وار ذکر کر دیں:

۱۔ جدید تعلیم اکثر انگلش میڈیم ہے اور پوش سکول چینز (Chains) اور یونیورسٹیوں کی نصابی کتابیں بالعموم غیر مسلموں اور غیر پاکستانیوں کی لکھی ہوتی ہیں جن میں ظاہر ہے اسلام اور پاکستان کا بیان ہمدردانہ اور لوکل کلچر کے مطابق مسلم جذبات کا خیال رکھنے والا نہیں ہوتا۔

۲۔ ایک پلاننگ کے تحت مقامی امتحانات کو ناقابل اعتماد ثابت کیا گیا اور کیمبرج کے او اے لیول کے امتحانات پاکستان میں رائج کیے گئے۔ اب جس ادارے کا امتحان دینا ہے ظاہر ہے نصاب اسی کا چلے گا۔ لاکھوں پاؤنڈ سالانہ کا پاکستانی کرنسی کو ٹیکہ الگ لگتا ہے اور مغرب کی ذہنی غلامی مفت میں ہاتھ آتی ہے۔

۳۔ اسی طرح مقامی گورنمنٹ سکولوں کے نظام کو ناقص اور بے توقیر ثابت کیا گیا بلکہ انہیں غیر مؤثر بنایا گیا اور پرائیویٹ سکولوں کی آبیاری کی گئی اور ان میں آکسفورڈ کی کتابیں رائج کی گئی یا ان کے چربے کے طور پر مقامی پبلشرز سامنے آئے۔ اسی طرح پوش سکول چینز سامنے آئیں جن کا نصاب ہی نہیں پورا تعلیمی ماحول مغرب زدہ ہوتا ہے مثلاً نوجوان لڑکیوں کے لیے بھی سوئمنگ پول اور میوزک کی کلاس۔

۴۔ پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیم کو کمرشلائیز کیا گیا۔ سکول چینز سے لے کر پرائیویٹ کالجز، یونیورسٹیاں ایک کارپوریٹ کاروبار بن گئیں جن میں بھاری بھرکم سرمایہ کاری کی گئی اور پھر ہر قیمت پر تعلیم کے ذریعے زیادہ سے زیادہ منافع خوری کے ہتھکنڈے اختیار کیے

گئے۔

۵۔ پری سکول سسٹم شروع کیا گیا جو پہلے صرف ''کچی جماعت'' کی صورت میں ہوتا تھا تا کہ بچے کو سکول جانے کی عادت پڑ جائے۔ وہ حروف تہجی اور ابتدائی گنتی سیکھ لے۔ اب پری سکول اور ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن سکول تعلیم کا اہم حصہ بن چکی اور اسے دو تین سال میں پلے گروپ، نرسری اور پریپ میں تقسیم کر کے ہر مرحلے کی کئی کتابیں چھاپی گئیں پھر ورک بک اور کلر بک اس کے ساتھ آئیں اور معصوم بچے کا بستہ اتنا بھاری ہو گیا کہ وہ اسے اٹھا نہیں سکتا۔

یاد رہے کہ ہمارے کلچر میں مائیں گھر پہ ہوتی تھیں اور ان کا بنیادی کام ہی گھر پہ بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت کرنا ہوتا تھا لیکن مغرب سے درآمد کردہ ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن کے تحت تین، ساڑھے تین سال کا بچہ پری سکول میں بھیج دیا جاتا ہے کیونکہ ماں باپ ساری رات بیٹھ کر انڈین، انگریزی یا پاکستانی فلمیں اور ڈرامے دیکھتے ہیں۔ یوں مام کو دن کو سونا ہوتا ہے لہٰذا بچے کو کون سنبھالے؟ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ اسے سکول میں پلے گروپ میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔ بلکہ اب تو کئی جگہ ڈے کیئر سنٹر بھی کھل گئے ہیں یعنی ماں اپنے دو تین ماہ کے بچے کو وہاں چھوڑ کر خود ملازمت پر چلی جاتی ہے اور بچہ ڈے کیئر سنٹر میں پرورش پاتا ہے۔

لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ مغرب میں یہ تجربہ ناکام ہو چکا۔ وہاں خاندان ٹوٹ چکا اور وہاں کی معاشرت تباہ ہو چکی۔ اصول سیدھا سادہ ہے کہ آج آپ بچے کو پیار محبت اور توجہ نہیں دیں گے تو وہ بڑا ہو کر آپ کو توجہ اور احترام نہیں دے گا۔ لیکن مغرب کی نقالی نے عقل چھین لی ہے۔

۶۔ یونیورسٹیوں میں مخلوط تعلیم ہے۔ ظاہر ہے نوجوان اور کچے ذہن کے لڑکوں اور لڑکیوں کا مخلوط نظام تعلیم ان کے اخلاق نہیں بگاڑے گا تو کیا کرے گا؟ پہلے یہ وبا پبلک سیکٹر

یونیورسٹیوں تک محدود تھی۔ پرائیویٹ سیکٹر یونیورسٹیوں نے اس آگ کو اور ہوا دی اور اب بقول بعض لوگوں کے یونیورسٹیاں قحبہ خانوں کا روپ دھار چکی ہیں۔

پنجاب میں مغربی ایڈوائزروں کے مشورے پر بے عقل حکمرانوں نے مخلوط تعلیم کو سکولوں تک پہنچا دیا اور طلبہ کے ساتھ سکول کے اساتذہ تک پہنچا دیا کہ لڑکوں کے سکولوں میں استانیوں کی ڈیوٹی لگا دی گئی اور لڑکیوں کے سکولوں میں مرد اساتذہ کی۔ اس کا جو نتیجہ نکلے گا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ رہی سہی کسر میڈیا نے پوری کر دی جو عریانی، فحاشی، بے حیائی اور زنا کاری پھیلانے اور اسے گلیمرائز کر کے پیش کرنے میں تعلیمی اداروں سے بھی بازی لے گیا اور اس نے سکولوں یونیورسٹیوں سے ابھرنے والی بے حیائی کو کئی گنا بڑھا دیا اور وہ بھی انتہائی تیزی سے۔

۸۔ حکومت پرائیویٹ تعلیم کو ریگولیٹ کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی اور نہ ان کو مانیٹر کرتی ہے لہٰذا پرائیویٹ تعلیمی ادارے کھمبیوں کی طرح گلی محلوں میں اُگ آئے ہیں جہاں میرٹ اور کوالٹی کا صرف نام استعمال ہوتا ہے، عملاً اس کا گزر بھی نہیں ہوتا۔

۹۔ نصاب مقامی نہیں رہا۔ غیر مسلم ملکوں کے نصاب کا چربہ رہ گیا ہے۔ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ یہ مقامی حالات کے مطابق ہے یا نہیں یا مقامی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے یا نہیں؟

۱۰۔ اساتذہ کی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ پرائیویٹ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تربیت اساتذہ کا تصور ہی موجود نہیں۔ جب تعلیم کاروبار ہے اور اصل ہدف زیادہ سے زیادہ نفع کمانا ہے تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کاروبار میں آمدنی زیادہ سے زیادہ اور اخراجات کم سے کم ہوں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اساتذہ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہوں، تاکہ ان کی تنخواہیں بھی معمولی (اور کم سے کم) ہوں۔ ان کی تربیت اور مزید تعلیم پر

ایک پیسہ خرچ نہیں کیا جاتا۔ ہاں! اور فیسیں زیادہ سے زیادہ ہوں اور فیس کے علاوہ بھی حیلے بہانے بچوں سے پیسے بٹورے جائیں۔

۱۱۔ جدید تعلیم میں اس بات کا کوئی تصور نہیں کہ علوم خصوصاً عمرانی علوم (Social Sciences) کو اسلامی تناظر میں مدون کیا جائے اور اسی تناظر میں ان کی تدریس کی جائے اور ان میں تحقیق کی جائے۔

۱۲۔ اسلامیات (جسے سکول میں دینیات کہا جاتا ہے اور یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ) کا نصاب نہایت ناقص ہے اور اسلامی شخصیت کو بنیادیں مہیا کرنے والا مواد اس میں طلبہ کو مہیا نہیں کیا جاتا۔ کئی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ میں ایم اے اور اس سے اوپر ایم فل و پی ایچ ڈی کا انتظام موجود ہے لیکن ان کا نصاب بھی خام ہے، طریق تدریس بھی اور پڑھانے والے اساتذہ بھی۔ جب اساتذہ کی اکثریت عربی اور انگریزی پر عبور نہ رکھتی ہو اور نہ طلبہ میں عربی اور انگریزی میں مہارت جزو نصاب ہو، جب 'اسلام اور مغرب'، 'اسلام و عمرانی علوم'، 'اسلام اور سائنس'، 'اسلام اور جدید مسائل'، 'اسلام اور مغربی تہذیب' جیسے مضامین نہ اساتذہ نے پڑھے ہوں اور نہ وہ پڑھائیں تو جدت، تنوع اور مہارت کہاں سے آئے گی اور ایسے اساتذہ اور طلبہ سے اسلامی علوم میں گہری تحقیق یا ان میں اجتہادی صلاحیت کا پیدا ہونا کیسے متصور کیا جائے؟

۱۳۔ جب تدریس کا وہ ماحول ہو جو ہم نے اوپر ذکر کیا تو اعلیٰ سطح کی تحقیق (پی ایچ ڈی وغیرہ) کا کیا معیار ہوگا؟ دوسرے علوم کا حال بھی اگرچہ پتلا ہے تاہم اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ انہی کالجوں یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل لوگ پاکستانی معاشرہ اور ریاست کو چلا رہے ہیں لہٰذا ان میں اتنی دنیاوی مہارتیں موجود ہیں جو وہ یہ کام کر رہے ہیں۔ البتہ جو چیز موجود نہیں وہ ان امور کا اسلامی تناظر ہے۔ یعنی جب تعمیر شخصیت میں اسلام شعوری سطح پر موجود ہی نہیں (جذباتی سطح پر معاشرے کی وجہ سے موجود ہے) تو اس کا مظاہرہ معاشرے

اور ریاست اور ان کے گونا گوں ادارے چلانے میں کیسے ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلامی اخلاق اور اسلامی اصولوں پر عمل ناپید ہے۔

۱۴۔ یونیورسٹیاں جنہیں علم و تحقیق کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے اور جنہیں علم ''پیدا'' کرنا چاہیے وہ بھی مغرب کی نقالی پر اکتفا کرتی ہیں۔ نہ مسلم اصولوں، مقاصد اور معیارات کے مطابق اور جنل/تخلیقی تحقیق ہوتی ہے اور نہ اس میں مسلمان معاشرے کی ضرورتوں اور تقاضوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس میں بھی مغرب کی نقالی آنکھیں بند کر کے کی جاتی ہے اور مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے۔

۱۵۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ انگریزی ذریعہ تعلیم چونکہ تفہیم پیدا نہیں ہونے دیتا اس لیے طلبہ رٹے (یعنی چیزوں کو بلا سمجھے رٹ لینا، زبانی یاد کر لینا یعنی Rote Learning) کی طرف چلے جاتے ہیں۔ یہ چیز بچے کی تخلیقی صلاحیتوں کو کچل دیتی ہے اور بڑے دماغ پیدا ہی نہیں ہوتے۔

۱۶۔ پاکستان میں شرح تعلیم بہت کم ہے۔ حکومت اس وقت (۲۰۲۱ء میں) ۶۰ فیصد کہتی ہے جبکہ اکثر لوگوں کے نزدیک یہ مبنی بر مبالغہ ہے اور حقیقی شرح تعلیم ۳۰، ۴۰ فیصد کے قریب ہے۔ پھر ''خواندگی'' کا معیار یہ ہے کہ آدمی دستخط کر سکتا ہو۔ اس 'معیار' کے مطابق اگر شرح خواندگی ۳۵، ۴۰ فیصد کے قریب ہے تو معاشرے اور ریاست کے تعلیمی معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

شرح تعلیم کی کمی کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک تو حکومتیں تعلیم کو اہمیت نہیں دیتیں اور

اس کے لیے زیادہ بجٹ مختص نہیں کرتیں[1]۔ دوسرے اس کی بڑی وجہ انگریزی ذریعہ تعلیم (انگلش میڈیم) ہے۔ اکثر بچے انگریزی سمجھ نہیں سکتے اور چالیس فیصد کے قریب تو پرائمری ہی میں سکول چھوڑ جاتے ہیں۔ جو اوپر جائیں ان کی اکثریت میٹرک میں انگریزی میں فیل ہوجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی کو لازمی مضمون کیوں رکھا جائے؟ اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم کیوں بنایا جائے؟ اس کی کوئی عقلی اور سائنٹفک دلیل نہیں ہے۔ جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ انتہائی بودے ہیں اور آسانی سے ردّ کیے جاسکتے ہیں اور ہم نے اپنی کتابوں میں بارہا کیے ہیں۔ اس کی اصل وجہ ہے فکری غلامی۔ مغرب اب بھی مسلمان معاشروں کو فکری (اور عملی) غلام رکھنا چاہتا ہے اور اس کا بڑا ذریعہ تعلیم ہے۔ تعلیم میں اس کو ایسے لوگ بآسانی مل جاتے ہیں (اور اس کی بڑی وجہ بھی نظام تعلیم ہی ہے۔ مغرب نے ہمارے ہاں وہ نظام تعلیم جاری رکھا ہے اور اپنے ایجنٹ حکمرانوں کو اسے بدلنے نہیں دیا جو اس نے اپنے استعماری دور میں یہاں قائم کیا تھا بلکہ اس نے میڈیا اور دیگر اقدامات سے اسے پختہ تر کیا ہے۔ اس وجہ سے اسے اشرافیہ/ اسٹیبلشمنٹ سے ایسے لوگ بآسانی اور وافر تعداد میں مل جاتے ہیں جو اس کے اشارے پر نظام تعلیم میں کوئی مؤثر تبدیلی نہیں ہونے دیتے اور اسلامی تبدیلی تو بالکل نہیں ہونے دیتے۔ اور وہ پاکستانی نظام تعلیم کو دن بدن ماڈرن، لبرل اور سیکولر بناتے جارہے ہیں اور اسے ویسٹرنائیز (Westernize) کرتے جارہے ہیں۔ اور انہوں نے ایسا ماحول پیدا کر رکھا ہے جس میں اردو میڈیم اور اسلامی سکول نہ پنپ سکیں۔

۱۷۔ استعماری دور کے نظام تعلیم کو ترک کر کے اسلامی اور مقامی بنیادوں پر نظام تعلیم

---

[1] یہ سوچنے کی بات ہے کہ حکومتیں تعلیم پر زیادہ توجہ کیوں نہیں دیتیں اور اس کے لیے زیادہ بجٹ کیوں نہیں رکھتیں؟ اس کی جڑیں سیاسی اور سماجی ہیں۔ پاکستان میں آج تک حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئی جو غریب یا متوسط طبقے کے ہوں۔ ظاہر ہے حکومت اشرافیہ کی ہو (جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی) تو وہ کیوں چاہیں گے کہ عوام تعلیم یافتہ اور باشعور ہوجائیں۔ وہ تو انہیں جاہل رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ اور ان کے ووٹوں کے ساتھ کھلواڑ کر کے (برادری کے نام پر، پیسے دے کر، مذہبی استحصال کے ذریعے) وہ آسانی سے جیت سکیں۔

کی اسلامی تشکیل نو کے تصور کو کبھی پاکستان میں بروئے کار نہیں آنے دیا گیا اور جو کام یہاں دینی عناصر کر سکے ہیں وہ ایک مفاہمانہ رویہ ہے یعنی جس طرح مغرب کی ملحدانہ، سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اسے ''اسلامی جمہوریت'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح نظام تعلیم میں ایک مریل سا غیر مؤثر اسلامیات کا لازمی مضمون شامل کر کے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ گویا پاکستانی نظام تعلیم اسلامی ہو گیا ہے۔ قرآن حکیم اور عربی زبان کی تدریس کو اہمیت دینے کی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی کی گئی ہے اور اس کے بارے میں اکثر ایگزیکٹو آرڈر بھی جاری ہوتے رہتے ہیں لیکن ان پر آج تک حقیقی معنوں میں عمل درآمد نہیں ہوا لہٰذا پاکستان کے نظام تعلیم میں جس امر کا کوئی دخل نہیں ہے وہ قرآن حکیم اور (اسے سمجھنے کے لیے) عربی زبان ہے۔

۱۸۔ اس میں حکمرانوں کے ساتھ افسوسناک کردار دینی عناصر کا بھی ہے۔ کچھ عناصر تو تعمیر شخصیت و کردار بذریعہ تعلیم کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے اور اسے کوئی اسلامی کام اور مطالبہ ہی نہیں سمجھتے گویا ''یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' کے الفاظ قرآن کے اندر موجود ہی نہ ہوں۔ دینی مدارس کے علماء سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دینی مدارس میں چند ہزار لوگوں کو ''دینی'' تعلیم دے دی تو گویا انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا، باقی معاشرہ ذمہ دار ہے۔ کروڑوں مسلمان بچوں کو جو جدید تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے ہیں (پاکستان میں ایسے تعلیمی اداروں میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد تقریباً چار کروڑ ہے جن میں سے دو کروڑ بچے پرائمری میں پڑھتے ہیں) ان کو اسلام پڑھایا جا رہا ہے یا نہیں، ان کی اسلامی تربیت ہو رہی ہے یا نہیں؟ یہ ان کا دردِ سر ہی نہیں۔ یہ ایک عجیب تصور ہے۔ ہم نے جب بھی علماء کرام سے اس موضوع پر بات کی وہ اس کے لیے بہت بودے دلائل دیتے ہیں (مثلاً یہ تو حکومت کا کام ہے۔ ہم تو بڑی مشکل سے دینی مدارس چلا رہے ہیں، ہمارے پاس وسائل نہیں وغیرہ) یا خاموش ہو جاتے ہیں۔

دینی عناصر کا ایک طبقہ پاکستان میں جدید دینی تحریکوں اور اداروں کا ہے۔ وہ کسی حد تک اسلامی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے بھی ہیں مثلاً جماعت اسلامی کے لوگ اور بعض دوسرے دینی گروہ۔ لیکن مغربی تہذیب کی مادہ پرستی کا سیلاب ان کو بہا کر لے گیا ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر ادارے کمرشل بنیادوں پر کام کر رہے ہیں یعنی تعلیم ان کے نزدیک اب ایک کاروبار ہے جس میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور پھر اس سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کی بلا سے ان کے سکولوں کالجوں یونیورسٹیوں میں کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ آکسفورڈ کی کتابیں یا بھارت اور دیگر غیر مسلم ممالک کی چھپی ہوئی کتابیں۔ طلبہ کی اسلامی تربیت کا نام بھی نہیں، نہ اساتذہ کی اسلامی تربیت کا کوئی منصوبہ۔ اکثر جگہوں پر لباس بھی مغربی مروج ہے نیز انگلش میڈیم و مانٹیسوری اور او اے لیول کے امتحانات یعنی مغربی تہذیب کے فروغ اور مغرب کی فکری غلامی کا پورا پورا اہتمام ہے لیکن ستم یہ کہ یہ سودا اسلام کے نام پر بیچا جاتا ہے۔ گویا "یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ" [البقرہ ۹:۲] کی مکمل تصویر۔ اس پر اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

فصل دوم: دینی مدارس کی تعلیم

ا۔ دینی مدارس نے بلاشبہ مسلم ہندوستان میں مثبت کردار ادا کیا۔ انگریزی استعمار نے جب مسلم نظام تعلیم ختم کر دیا اور دینی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ اور علماء کرام بھی فارغ ہو گئے تو انہوں نے اس خدشے سے کہ ہندوستان کا حال اندلس جیسا نہ ہو، بغیر وسائل کے بنیادی دینی تعلیم طلبہ کو دینی شروع کی۔ اس میں انہیں بلاشبہ فقر و فاقہ کا سامنا کرنا اور درختوں کے نیچے اور مٹی کے حجروں میں انہوں نے دینی تعلیم کی شمع روشن رکھی۔ معاصر علوم کی طرف توجہ نہ کرنے کے ان کے پاس کئی عذر تھے مثلاً: ا۔ ان کے پاس مادی وسائل نہ تھے، انہیں انگریز سے نفرت تھی اور وہ حکومت کے لیے کارکن تیار نہ کرنا چاہتے تھے جو اس

سے پہلے وہ مسلم ریاست کو مہیا کرتے تھے لیکن یہ سارے اعذار قیام پاکستان کے ساتھ ختم ہو گئے ۔ اب ملک مسلمانوں کا تھا اور ریاست وحکومت جیسی بھی تھی بہر حال اسلام کی اطاعت کا دم بھرتی تھی اور حکمران جیسے بھی تھے بہر حال مسلمان تھے اور اسلام اور اس کی بالادستی کے منکر نہ تھے۔

۲۔ دینی مدارس کے علماء کرام کو پہلا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ اپنے مقاصد تعلیم پر نظر ثانی کرتے۔ پہلے ان کا مقصد تھا مساجد اور مدارس کے لیے علماء تیار کرنا تا کہ انفرادی سطح پر مسلمان اسلام کے بنیادی احکام نماز روزہ اور نکاح طلاق پر عمل کر سکیں۔ اب ان کا ہدف عام تعلیم ہونا چاہیے تھا یعنی مساجد و مدارس کے لیے علماء تیار کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے اور ریاست کے لیے کارکن تیار کرنا اور افراد معاشرہ کی دینی تعلیم و تربیت کرنا۔

۳۔ اس کے لیے ضروری تھا ثنویت کا خاتمہ یعنی تعلیم میں دوئی ختم کرنا کہ دنیاوی تعلیم الگ کوئی شے ہے اور دینی تعلیم الگ۔ علماء کو چاہیے تھا کہ وہ تعلیم کے اس ڈھب کی طرف لوٹ جاتے جس پر ان کے اسلاف بارہ سو سال سے عمل کرتے آرہے تھے یعنی وحدت تعلیم (Integrated Education) کا تصور یعنی نظام تعلیم ایک ہی ہوگا جس میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم دی جائے گی۔ آپ ملا نظام الدین سہالویؒ کا تعلیمی نصاب اٹھا کر دیکھ لیجیے (تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''ہمارا دینی نظام تعلیم'') وہ متخصص علماء تیار کرنے کا نصاب نہیں ہے بلکہ وہ مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے افراد کار مہیا کرنے کا نصاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تفسیر میں بیضاوی اور حدیث میں مشکوٰۃ کے علاوہ کوئی 'دینی' کتاب نہیں اور باقی مضامین فقہ، فارسی، عربی، حساب، ہندسہ، ہیئت، فلسفہ اور منطق کے ہیں۔ دیوبند نے مکمل درس نظامی نہیں اپنایا۔ اس کے کچھ اجزا کو لے کر پھیلا لیا اور باقی کو چھوڑ دیا لیکن طرفہ تماشا یہ کہ یہ نصاب ''درس نظامی'' کے نام سے مشہور ہے۔

۴۔ علماء کرام کہتے ہیں نصاب میں تبدیلی حکومت کو کرنی چاہیے تھی۔ حکومت تعلیمی

ثنویت ختم کرتی، جدید تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالتی اور خود دینی تعلیم دینے کا مؤثر انتظام کرتی تو ہماری ذمہ داری ختم ہوجاتی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے۔ بلاشبہ حکومت پاکستان کو تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کرنا چاہیے تھی جو اس نے نہیں کی۔ سوال یہ ہے کہ اس پر دینی مدارس کے علماء کا رویہ کیا ہونا چاہیے تھا؟ ہم کہتے ہیں کہ انہیں اپنے مدارس کے نصاب ونظام کو خود بدل لینا چاہیے تھا۔ مسلمان معاشرے اور حکومتوں میں تعلیم بارہ سو سال سے علماء کے ہاتھ میں تھی، پرائیویٹ سیکٹر میں تھی۔ علماء اور ان کے مدارس آزاد تھے۔ علماء حکومت کے ملازم نہیں ہوتے تھے ہاں! یہ صحیح ہے کہ معاشرہ اور حکومتیں ان کی پشت پناہ تھیں اور انہیں درکار مادی وسائل مہیا کرتی تھیں۔ اگر وہ اپنی پرانی روش پر لوٹ جاتے تو یقیناً معاشرہ ان کا ساتھ دیتا اور طوعاً وکرہاً حکومت کو بھی ساتھ دینا پڑتا جیسا کہ بنگلہ دیش، انڈونیشیا اور کئی دوسرے مسلمان ملکوں میں ہورہا ہے کہ دینی مدارس کی دین ودنیا کی تعلیم کو حکومت مادی وسائل بھی مہیا کرتی ہے اور ان کی ڈگریوں کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ لیکن پاکستانی مدارس کے علماء نے یہ نہ کیا اور تقسیم ہند سے پہلے کے مدارس کے نصاب ونظام کو جاری رکھا۔

۵۔ یہ ایک بہت غلط فیصلہ تھا جس کے شدید نقصانات پاکستانی مسلم معاشرے اور ریاست کو پہنچتے۔

i۔ تعلیمی ثنویت سے مسلم معاشرے میں ثنویت پیدا ہوگئی اور مسلم معاشرہ مسٹر اور ملا میں تقسیم ہوگیا یعنی ایک مذہبی آدمی ہوتا ہے اور ایک غیر مذہبی آدمی ہوتا ہے حالانکہ یہ ثنویت اسلام میں موجود ہی نہیں۔ اسلام دین ودنیا میں تفریق کرتا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک دین ودنیا ایک وحدت ہیں۔ دنیا اگر دین کے مطابق گزاری جائے تو یہ عین عبادت ہے، عین دین ہے۔ دین اور شریعت تو ہے ہی دنیا کی زندگی گزارنے کی ہدایت اور رہنمائی کا نام۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ دنیا قرآن کے لفظوں میں امتحان گاہ ہے جس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا۔

بدقسمتی سے یہ وہ سیکولرزم ہے جسے مدارس کی تعلیم نے مسلم معاشرے میں رواج دیا ہے۔ ہم مغربی تہذیب کے سیکولرازم کو رڈ کرتے ہیں بلکہ اسے گالی دیتے ہیں۔ دینی مدارس نے جس سیکولرازم کو فروغ دیا ہے، اسے رڈ کر کے اور دینی مدارس کے اس رویے کی مخالفت کر کے علماء سے پتھر کون کھائے؟

ii۔ مدارس کا یہ رویہ بنیاد بنا علماء کے معاشرے سے کٹ جانے کا اور خصوصاً ان کے جدید/ معاصر/ دنیاوی تعلیم سے بے تعلق ہو جانے کا۔ اور یہ بہت بڑا ظلم ہوا۔ ہم نے علماء کی کئی نشستوں میں ان سے کہا کہ آپ ملک بھر میں چند ہزار طلبہ کو ''دین'' سکھا رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ جو چار کروڑ مسلمان پاکستانی بچے جدید سکولوں کالجوں یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں ان کو دین سکھانا اور ان کی دینی تربیت کرنا کیا آپ کی ذمہ داری نہیں؟ اس پر وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم بمشکل مانگ تانگ کے دینی مدارس چلا رہے ہیں اب سکول کالج بھی ہم ہی چلائیں؟

iii۔ اس کا ایک بڑا نقصان جس کا ادراک اہل علم دانش کو ہونا چاہیے (کہ یہ عام آدمی کا میدان نہیں) وہ یہ ہے کہ دینی مدارس (اور پاکستان میں دینی مدارس کی اکثریت حنفی دیوبندی فکر کی ہے) اپنے لائحہ عمل سے دین کا جو تصور پیش کر رہے ہیں وہ بلاشبہ دین کا ناقص اور جزوی تصور ہے۔ بھلا وہ دین کا کون سا تصور ہے جسے ہماری اجتماعی زندگی سے غرض نہیں؟ کیا کلمہ سیدھا کرا دینا اور نماز روزے کی تلقین کر دینا پورا دین ہے؟ یا ایسی دینی تعلیم دینا جس میں فارغ التحصیل علماء کو اسلام کے سیاسی نظام، اسلام کے معاشی نظام، اسلام کے تعلیمی نظام.... کی خبر ہی نہ ہو اور جس میں طلبہ کو عصر حاضر میں مسلم امہ کو درپیش سب سے بڑے چیلنج (یعنی مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب اور اس تہذیب کے علمبردار اسلام اور مسلم دشمن مغربی ممالک کے چیلنج) کی خبر ہی نہ ہو وہ کیسا تصور دین ہے؟

iv۔ دینی مدارس کی تعلیم کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نے مسلک پرستی اور فرقہ

واریت کا روپ دھار لیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو 'خالص مذہبی معاملات' تک محدود رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ دنیاوی/عصری/ جدید علوم اپنے طلبہ کو پڑھاتے تو انہیں آج کے زندہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا مثلاً یہ کہ آج اسلام کے معاشی نظام کی صورت کیا ہوگی؟ اسلام کا سیاسی نظام کیسا ہوگا اور وہ کیسے نافذ ہوگا؟ اس طرح کے زندہ مسائل کا سامنا نہ کرنے کی وجہ سے آج کے علماء کے نزدیک امہات مسائل کیا ہیں؟ یہ کہ رفع یدین ہونا چاہیے یا نہیں؟ سر پہ ٹوپی رکھنی فرض ہے یا نہیں؟ اذان سے پہلے درود شریف پڑھنا چاہیے یا نہیں؟ اس طرح کے معمولی، فروعی اور ضمنی مسائل ان کو مسلک پرستی اور فرقہ واریت کی طرف دھکیلتے ہیں۔ اگر وہ آج کے زندہ مسائل کی طرف آتے تو شاید اس مسلک پرستی اور فرقہ پرستی کا زور کچھ کم ہو جاتا کیونکہ ان جدید مسائل کا تعلق نہ حنفیت سے ہے نہ شافعیت سے۔

۷۔ دینی مدارس کے اس رویے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہو سکی۔ اس کے ذمہ دار دینی مدارس اس لیے ہیں کہ انہوں نے ایسی افرادی قوت تیار ہی نہیں کی جو ریاستی اور معاشرتی اداروں میں جا کر مثبت اور تعمیری کردار ادا کر سکتی۔ دینی مدارس کے لوگ نہ فوج میں جا سکتے ہیں، نہ عدلیہ میں جا سکتے ہیں، نہ بیوروکریسی میں جا سکتے ہیں، نہ پولیس میں جا سکتے ہیں تو وہ ریاست کو اسلام کے مطابق کیسے چلائیں گے؟

مدارس نے اپنی اس روش سے معاشرے اور ریاست چلانے کا نظام گویا خود ان لوگوں کے حوالے کر دیا ہے جو عصری کالجوں یونیورسٹیوں سے مغرب زدہ تعلیم پڑھ کر فارغ ہوئے ہیں جہاں نہ انہیں اسلام پڑھایا گیا اور نہ ان کی اسلامی تربیت کی گئی اور نہ اس میں علماء نے کوئی کردار ادا کیا۔ دین سے بے بہرہ ان لوگوں کو معاشرے اور ریاست کی قیادت سپرد کرنا دینی مدارس ہی کا کارنامہ ہے لہٰذا پاکستان میں اگر اسلام نافذ نہیں ہوا تو اس کا ذمہ دار دینی مدارس کو کیوں نہ قرار دیا جائے؟

۶۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مدارس کے اندر سے اصلاح کی آواز اٹھتی لیکن ایسا ہونہیں سکا۔ اب مدارس (اوران کے وفاق) حکومتوں کا دباؤ قبول کررہے ہیں اور حکومتیں امریکہ ویورپ کا دباؤ قبول کررہی ہیں۔ اور مدارس میں اصلاح کی طرح طرح کی آوازیں اٹھ رہیں ہیں۔ امریکہ ویورپ کا بس چلے تو مدارس کا گلا فوراً گھونٹ دیں لیکن ڈپلومیٹک مجبوریاں کہ حکومت پاکستان کے ذریعے کام کرنا پڑتا ہے اور حکمران سومغربی ایجنٹ سہی، زمینی حقائق کا انہیں بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ سول حکومت کو ناکام دیکھ کر خود آرمی چیف مدارس کے معاملے کو دیکھ رہے ہیں اور مدارس کے نمائندوں سے ملاقاتیں اور معاہدے ہورہے ہیں اور ترغیب وترہیب سے کام نکالنے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ ہمارے جیسے علماء کے خادم پچھلی ربع صدی سے یہ باتیں علماء کرام سے کہہ رہے ہیں لیکن انہوں نے سنا اَن سنا کردیا۔ وہ اپنے آپ کو بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ گویا ہماری باتیں ایک کان سے سنتے ہیں دوسرے سے نکالتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی عرض کی کہ یہ نہ دیکھیے کہ کون کہہ رہا ہے، یہ دیکھیے کہ کیا کہہ رہا ہے! لیکن علماء کرام ہماری بات سننے، تبادلۂ خیال کرنے بلکہ بات پر غور کرنے کے لیے ہی تیار نہیں ہوئے۔ اب مغربی حکومتوں کے ساتھ ان کی یونیورسٹیاں اور این جی اوز بھی متحرک ہیں اور مدارس میں اپنی مرضی کی تبدیلی لانے کے جتن ہورہے ہیں۔

ان کی ایک مثال مدرسہ ڈسکورسز کی ہے۔ ایک امریکی مشنری کیتھولک یونیورسٹی نوٹرے ڈم نے ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ اور ہامان مرزا جیسے متجددین ڈھونڈ لیے ہیں جنہوں نے پاک وہند سے اپنی طرح کے دو متجددین ڈھونڈ نکالے ہیں یعنی ہندوستان سے دیوبند کے فاضل اور مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے پوتے ڈاکٹر شکیب ارسلان صاحب اور پاکستان میں امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر مرحوم کے پوتے ڈاکٹر عمار ناصر صاحب (جو پاکستان میں سرخیل متجددین جاوید غامدی صاحب کے تلمیذ رشید ہیں) جو اپنے اثر ورسوخ

سے ان دونوں ممالک سے دینی مدارس کے طلبہ امریکیوں کو مہیا کریں گے تاکہ وہ انہیں مغربی فکر وتہذیب کا بپتشمہ دے سکیں۔ چنانچہ یہ کارِ بد جاری ہے۔

۷۔ پاکستان میں دینی مدارس کو بتدریج بہت فروغ ملا ہے جس کے اسباب کئی ایک ہیں مثلاً جنرل ضیاء الحق کی اسلامی پالیسیاں، افغان جہاد، سعودی عرب اور امارات وغیرہ کا سرمایہ وغیرہ۔ ضیاء الحق صاحب نے ان کی ڈگریوں کو تسلیم کرنے کی غرض سے ان کے پانچ امتحانی بورڈ (وفاق) بنادیے اور بدقسمتی یہ کہ یہ مسالک کی بنیاد پر بنے۔ ایک حنفی دیوبندی مدارس کا (وفاق المدارس العربیہ)، دوسرا حنفی بریلوی مسلک کا (تنظیم المدارس الاسلامیہ) تیسرا اہل حدیثوں کا (وفاق المدارس السّلفیہ)، چوتھا اہل تشیع کا (وفاق مدارس الشیعہ) اور پانچواں جماعت اسلامی کا [جسے یار لوگ اب پانچواں فرقہ کہتے ہیں]۔ رابطۃ المدارس الاسلامیہ)۔

اہل تشیع کو چھوڑ کر اہل سنت کے باقی چاروں وفاقوں کے نصاب میں کوئی خاص فرق نہیں۔ سارے قرآن حکیم کی تفسیر بیضاوی پڑھاتے ہیں، حدیث میں صحاح ستہ سب پڑھاتے ہیں، فقہ میں ہدایہ سب پڑھاتے ہیں، سب عربی پڑھاتے ہیں.... وغیرہ وغیرہ لیکن وہ ایک امتحانی بورڈ بنانے کے لیے تیار نہیں۔ ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے جان بوجھ کر ان کے الگ الگ وفاق بنوائے ہیں اور وہ ان کے ذریعے فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہے تاکہ مولوی آپس میں لڑتے رہیں اور سیکولر سیاسی جماعتیں آرام سے الیکشن جیت کر حکومتیں چلاتی رہیں۔ جس طرح جدید تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے کہ حکومت ایک نصابی خاکہ دے دیتی ہے اور مختلف ناشرین اس کے مطابق اپنی اپنی کتابیں مدون کر کے حکومت سے ان کی منظوری لے لیتے ہیں۔ دینی مدارس کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ اہل سنت کے چاروں وفاق مل کر ایک وفاق بنالیں۔ ان کا نصاب ایک ہو لیکن نصابی کتب الگ الگ ہوں لیکن یہ وفاق اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

پاکستان کے مشہور ادیب، اسلام پسند دانشور اور اردو زبان تحریک کے روح رواں پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگر میرا کسی شخص کے ساتھ ۹۹ معاملات میں اختلاف ہو اور ایک معاملے میں اتفاق ہو تو میں ۹۹ اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس ایک معاملے میں، جس پر میرا اور اس کا اتفاق ہے، اس کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہوں۔ اس کے برعکس ہمارے دینی لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ہم صرف اس آدمی کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں جس سے ہمارا سو فیصد اتفاق ہو۔ اگر ان کا کسی آدمی سے ۹۹ معاملات میں اتفاق ہو اور صرف ایک معاملے میں اختلاف ہو تو وہ اس کے ساتھ مل کر ان ۹۹ معاملات پر کام نہیں کر سکتے جو ان کے درمیان مشترک ہے جب تک ان کے درمیان وہ ایک فیصد اختلاف باقی ہے۔

۸۔ ان وفاقوں کے جہاں بہت سے فائدے ہیں، وہیں ان کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ ان کی وجہ سے دینی مدارس کے نصاب و نظام میں اصلاح کا عمل رک گیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب مدارس آزاد تھے تو ہم جیسا شخص، فرض کیجیے کسی مدرسہ کے مہتمم صاحب کو قائل کر لیتا تو وہ مہتمم صاحب اپنے مدرسہ کے نصاب و نظام میں تبدیلی لا سکتے تھے لیکن جب سے وفاق بنے ہیں اور ان کی ڈگریاں حکومت نے منظور کی ہیں تو اس وفاق سے ملحق سارے مدارس مجبور ہیں کہ اس وفاق کا نصاب پڑھائیں اور اس کا امتحان دلوائیں۔ وہ اگر اپنے طلبہ کے لیے اضافی مضامین یا نظر ثانی شدہ مضامین پڑھانا چاہیں تو طلبہ اس میں دلچسپی نہیں لیتے کیونکہ وہ اسی مضمون پر محنت کرنا چاہتے ہیں جس کا انہوں نے وفاق کا امتحان دینا ہے۔ دوسری باتوں میں طلبہ کی دلچسپی بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ڈگری وفاق کی بجائے مدرسہ نے دینی ہو تو پھر طلبہ مدرسہ کا مجوزہ نصاب پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ یوں دیکھا جائے تو دینی مدارس کے وفاق مدارس میں کسی مثبت تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

۹۔ دینی مدارس کے نظام کا ایک بے ڈھبا پن یہ ہے کہ نہ ابتداء ان کے ہاتھ میں ہے

اور نہ انتہاء۔ یہ درمیان میں طلبہ کو کچھ عرصے کے لیے اچک لیتے ہیں۔ یہ عموماً مڈل اور میٹرک پاس طلبہ کو داخلہ دیتے ہیں (اگرچہ بعض دیہاتی یا قصباتی مدارس ایسے حافظ قرآن بچوں کو بھی داخلہ دے دیتے ہیں جنہوں نے سکول کا منہ بھی نہ دیکھا ہو) اور میٹرک پاس بچوں کو دوبارہ اپنے ہاں کا ثانویہ عامہ کرواتے ہیں جو ان کی اسکیم آف سٹڈیز کی رو سے میٹرک کے برابر ہے ان کی اسکیم آف سٹڈیز یہ ہے:

ثانویہ عامہ ۲ سال (بعض اضافی مضامین پڑھنے کی شرط کے ساتھ مساوی میٹرک)
ثانویہ خاصہ ۲ سال (بعض اضافی مضامین پڑھنے کی شرط کے ساتھ مساوی ایف اے)
عالیہ ۲ سال (بعض اضافی مضامین پڑھنے کی شرط کے ساتھ مساوی بی اے)
عالمیہ ۲ سال

مدارس کی عالمیہ کی سند حکومت پاکستان (ہائر ایجوکیشن کمشن HEC) کی طرف سے صرف تعلیمی معاملات کے لیے ایم اے اسلامیات وعربی کے مساوی ہے۔ اس کے بعد مدارس کے طلبہ اگر اعلیٰ تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو انہیں جدید یونیورسٹیوں میں ایم فل و پی ایچ ڈی کے لیے داخلہ لینا پڑتا ہے۔ بعض بڑے مدارس میں ایک یا دو سال کا تخصص (عموماً فقہ وافتاء کا) کرایا جاتا ہے جس کا حکومت کے ساتھ کوئی معادلہ نہیں۔

مبحث سوم: اصلاحی کوششیں

یہاں ہم پہلے یہ ذکر کریں گے کہ اصلاحی کوششیں کس طرح کی اور کس سمت میں ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ یہ کامیاب ہوئی ہیں یا ناکام؟ خصوصاً ان معنوں میں کہ کیا تبدیلیاں ہدف ہونا چاہئیں تھیں اور کیا کرنے کی کوششیں ہوئیں اور ان کا کیا نتیجہ نکلا؟

حکومتی کوششیں

جو کوششیں ہوئیں ان میں سے بعض حکومت کی طرف سے ہوئیں مثلاً جامعہ عباسیہ

بہاولپور ریاست بہاولپور کی ایک بڑی دینی جامعہ تھی۔ جب ریاست نے پاکستان کے ساتھ الحاق اور اس میں ضم ہونے کا فیصلہ کیا تو جامعہ عباسیہ کو ایک اسلامی یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کا فیصلہ ہوا یعنی اسے بہاولپور اسلامی یونیورسٹی (جامعہ اسلامیہ بہاولپور) بنانے کا اعلان کیا گیا۔ ابتدائی چند سال کچھ اچھا کام ہوا پھر بتدریج پاکستانی حکمرانوں، بیوروکریسی اور وزارت تعلیم کے بزرجمہروں کا سیکولر و لبرل رنگ اسلامی یونیورسٹی پر غالب آتا گیا۔ سارے عمرانی و سائنسی علوم اس یونیورسٹی میں پڑھانے شروع کر دیے گئے اور وہ بھی دوسری پاکستانی یونیورسٹیوں کی طرح مغرب زدہ انداز میں۔ یوں یونیورسٹی میں اسلام صرف شعبہ علوم اسلامیہ میں رہ گیا اور وہاں بھی جب روایتی علماء نہ رہے اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل اساتذہ وہاں غالب آ گئے تو جتنا سطحی علم اور مطالعہ اساتذہ کا تھا، اسی طرح کے تلامذہ اسلامیات میں ڈگریاں لے کر امتحان پاس کرنے لگے۔ اور آج اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اسی طرح کی ایک جدید یونیورسٹی ہے جس طرح کی مثلاً پنجاب یونیورسٹی یا کراچی یونیورسٹی ہے اور اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ اور ان سب کا رول ماڈل ایک ہی ہے یعنی علی گڑھ یونیورسٹی۔ یہ یونیورسٹیاں نہ صرف یہ کہ اسلام کی کوئی خدمت نہیں کر رہیں الٹا مغربی فکر و تہذیب کے معاشرے میں فروغ اور غلبے کا سبب بن رہی ہیں۔

حکومتی سطح پر دوسرا تجربہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی صورت میں ہوا۔ اس میں چونکہ بورڈ آف ٹرسٹیز ملی سطح کا ہے یعنی سعودی عرب اور مصر وغیرہ کے نمائندگان بھی اس میں موجود ہوتے ہیں اور یونیورسٹی کا صدر (وائس چانسلر) عموماً عربی ہوتا ہے اس لیے یہ یونیورسٹی بھی اگرچہ پاکستانی معاشرے اور ریاست کے لبرل و سیکولر اثرات قبول کر رہی ہے لیکن اس کی رفتار سست ہے۔ یونیورسٹی ۱۹۸۰ میں قائم ہوئی اور آج ۲۰۲۰ء میں بھی اس میں خیر کے کافی اثرات ابھی باقی ہیں۔ اسلامی علوم کے شعبوں کے علاوہ عمرانی علوم اور سائنسی علوم کے شعبوں میں بھی اسلامی کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ طلبہ کی اسلامی تربیت

کے لیے بھی کوشش ہوتی ہے۔ اکنامکس میں قابل اساتذہ کی ایک ٹیم شروع میں ہی ادارے کو میسر آ گئی تھی جس نے بہت عمدہ کام کیا اور نام کمایا۔ عام یونیورسٹیوں سے ہٹ کر اس جامعہ میں دعوہ اکیڈمی اور شریعہ اکیڈمی موجود ہیں اور ادارہ تحقیقات اسلامی بھی، جو یونیورسٹی کے قیام کے بہت پہلے سے کام کر رہا تھا اور اس میں نامور سکالر کام کرتے رہے ہیں۔ ذریعۂ تعلیم بھی یہاں عربی اور انگریزی ہے۔

اس یونیورسٹی کی ان خوبیوں کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اس کے باوجود علوم کی وحدت کا کام یہاں نہیں ہو سکا مثلاً فقہ و اصول فقہ مصری اساتذہ عربی میں پڑھا دیتے ہیں اور پاکستانی اساتذہ ایل ایل بی الگ سے کروا دیتے ہیں۔ دونوں کے امتزاج کی کوئی صورت نہیں۔ اسی طرح عمرانی علوم اور سائنسی علوم کے نصابات اسلامی تناظر میں مدون و مرتب نہیں کیے گئے صرف اسلامیات کا اضافی کورس پڑھا دیا جاتا ہے۔

حکومت نے دینی مدارس میں اصلاح کے لیے ایک مدرسہ بورڈ بنایا اور اس سے الحاق کی ترغیب دینے کے لیے مدارس کو کئی ترغیبات دی گئیں لیکن دینی مدارس اور ان کے وفاقوں نے اس کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور یوں وہ ناکام ہو کر صرف کاغذوں میں باقی رہ گیا۔

مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی تھوڑا عرصہ مرکز میں وزیر مذہبی امور رہے۔ اس دوران انہوں نے مدارس کی اصلاح کے کئی منصوبے بنائے اور کئی ماڈل دینی مدارس قائم کیے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی ذاتی نگرانی میں عمدہ نصاب بنوایا جو اگر جاری رہتا تو انقلابی ثابت ہوتا لیکن ان کے وزارت سے استعفیٰ دینے کے بعد ساری اسکیم غتر بود ہو گئی اور وہ ماڈل مدارس غیر فعال اور غیر مؤثر ہو گئے۔

ہر صوبے میں اوقاف کا محکمہ موجود ہے جس کے پاس کافی فنڈز ہوتے ہیں اور بہت سی مساجد اور مدارس اس کے ماتحت ہوتے ہیں لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت غیر فعال اور غیر

مؤثر ہے۔

اس صورتِ حال سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پاکستانی ریاست وحکومت، اس کے حکمران، اس کے بیوروکریٹس، اس کی فوج، اس کی عدلیہ، اس کی پولیس سب کی تربیت اور مزاج سیکولر و لبرل ہے اور ان کے ہاں کوئی حقیقی اسلامی تبدیلی قابل قبول نہیں۔ انہوں نے جو ماحول بنا رکھا ہے اس کی حیثیت کانِ نمک کی ہے، جو بھی اس میں جاتا ہے نمک ہو جاتا ہے۔ اس کا رویہ بنیادی طور پر اسلام سے منافقت کا ہے کہ اسلام کا نام لیتے رہو اور اس پر عمل بالکل نہ کرو۔ اور یہ دنیا پر غالب مغرب کے ملحدانہ فکر وتہذیب کے سچے پیروکار ہیں اور اس کی تعلیمات، اصولوں اور اقدار پر دل وجان سے عمل کرتے ہیں۔

اصلاحی جدوجہد: علماء کرام کی طرف سے

دینی مدارس کے علماء کرام کا رویہ دینی مدارس کے نصاب ونظام تعلیم کے حوالے سے جمود کا ہے۔ اس کے لیے بطور مثال ہم وہ واقعہ دہرایا کرتے ہیں کہ جب راقم ۱۹۹۶ء میں اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا تو متحدہ علماء کونسل کے مولانا عبدالرؤف ملک صاحب نے کسی اماراتی این جی او سے مل کر اصلاح مدارس دینیہ پر دوروزہ ورکشاپ ایک فور سٹار ہوٹل میں رکھی۔ راقم نے پہلے دن سارا وقت وہیں گزارا۔ پاکستان بھر سے مدارس کے علماء کرام تشریف فرما تھے۔ چھوٹا مائک گھوم کر ایک ایک کر کے علماء کے سامنے جا رہا تھا کہ مائک ایک گورے چٹے اونچے لمبے جناح کیپ پہنے مولانا صاحب کے سامنے آیا۔ انہوں نے مائیک سیدھا کیا، ٹِک ٹِک کیا اور دیکھا کہ آن ہے یا نہیں، پھر کہا کہ ہمارا نصاب قرآن وسنت پر مبنی ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ یہ کہا اور مائیک کھسکا کر اگلے مولانا صاحب کی طرف کر دیا۔ میں چونکہ ان مولانا صاحب کو پہچانتا نہیں تھا اس لیے ساتھ بیٹھے آدمی سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون ہیں؟ انہوں نے کہا یہ مولانا عبدالقیوم ہزاروی ہیں جو جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور کے مہتمم ہیں۔ اہل سنت بریلوی مسلک کے بڑے

علماء میں سے ہیں بلکہ وفاق تنظیم المدارس الاسلامیہ کے صدر ہیں۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دینی مدارس کے علماء کی بہت بڑی اکثریت درس نظامی کے اپنے اختیار کردہ نصاب کو قرآن وسنت کی طرح مقدس سمجھتی ہے اور اس میں کسی تبدیلی کا سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ ان حالات میں دینی مدارس کے نصاب ونظام میں اصلاح کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ وفاقوں کے نظام نے کسی ممکنہ تبدیلی کو مزید مشکل بنا دیا ہے کیونکہ یہ وفاق ملک گیر ہیں۔ ان میں کئی گروپ اور لابیاں علاقائی، لسانی، سیاسی اور فقہی اختلافات کی وجہ سے فعال ہوتی ہیں جو زیر زمین ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچ رہی ہوتی ہیں اور انہیں کسی نئی تبدیلی پہ آمادہ اور متفق کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بعض علماء کرام نے البتہ یہ رویہ اختیار کیا ہے کہ اپنے دینی مدارس کے ساتھ سکول بھی کھول رکھا ہے جیسے دارالعلوم کراچی کے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے دارالعلوم کے ساتھ ایک ہائی سکول بھی کام کرتا تھا۔

پچھلے چند سالوں میں مغربی اور حکومتی دباؤ پر مدارس میں عصری تعلیم اور عصری علوم کی تدریس کا رجحان پیدا ہوا ہے لیکن دو وجوہ کی بناء پر یہ رویہ مفید ثابت نہیں ہو رہا۔

۱۔ علماء کرام کرتے یہ ہیں کہ اپنا درس نظامی چلاتے رہتے ہیں اور ساتھ ان طلبہ کو جو کسی عصری سطح (مثلاً میٹرک، ایف اے وغیرہ) کا امتحان دینا چاہتے ہیں انہیں اضافی مضامین باہر جا کر پڑھنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اِکّا دُکا مدارس خود بھی اس کا انتظام کر دیتے ہیں۔ جن چند مدارس نے سکول کھول رکھے ہیں وہ بھی درس نظامی کو الگ اور عصری علوم کو الگ الگ پڑھاتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے وحدت تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ طلبہ پر دوہرا بوجھ پڑ جاتا ہے اور صرف ذہین اور محنتی طلبہ ہی اس میں چل سکتے ہیں، ہر کہہ ومہ نہیں۔ اس سے ذہن اور شخصیت بھی دو خانوں میں بٹتی چلی جاتی ہے۔

۲۔ جن علماء کرام نے سکول کھول رکھے ہیں وہ معاشرے میں مروج مغرب زدہ عصری تعلیم کو ویسے ہی لے لیتے ہیں جیسی وہ ہے۔ ان میں اتنا وژن اور بصیرت نہیں کہ وہ ان

جدید علوم اور نصابات کی اسلامی تشکیل نو بلکہ جدید معاصر تعلیم کی بحیثیت مجموعی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کا سوچ سکیں یا اس کے لیے کچھ اقدامات کر سکیں۔ بلکہ ان میں سے کئی ایک تو مونٹیسوری، او اے لیول، انگلش میڈیم وغیرہ کو اپنا لیتے ہیں اور والدین سے بھاری بھر فیسیں وصول کرتے ہیں اور اسلامائیزیشن کے نام پر چند سادہ اور غیر مؤثر اقدامات تک محدود رہتے ہیں جیسے قرآن حفظ کرا دیا یا دعائیں یاد کرا دیں وغیرہ۔ پورے نظام تعلیم یا سارے نصابات کی اسلامی تشکیل نو کا کوئی تصور ان کے ذہن میں موجود نہیں ہوتا (اس طرح کے سکول کئی علماء نے کھول رکھے ہیں)۔ اور اگر ہم جیسا کوئی سودائی ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی جرأت کرے تو وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے اور بعض تو ناراض ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کی کوششوں کا ایک بڑا نام کراچی کی جامعۃ الرشید ہے جس نے اس ضمن میں کئی اقدامات کیے ہیں اور بہت سے کورسز شروع کرا رکھے ہیں۔ بلاشبہ ایک عارضی اور وقتی حل کے طور پر (یعنی بطور Stop-gap Arrangement) یہ روش مفید ہے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کو جدید علوم سے متعارف کرا دیا جائے یا انہیں کچھ انگریزی اور کمپیوٹر سکھا دیا جائے اور اسی طرح جدید تعلیم کے فارغ التحصیل طلبہ کو بنیادی دینی تعلیم دے دی جائے۔ خود ہم نے ابتداء اسی کام سے کی تھی اور دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے کئی برس تک ہم نے کئی سطحوں کے کورس کرائے، چند ہفتوں سے لے کر ایک سال کے اقامتی پروگرام تک اور عام لوگوں کو تجوید، ترجمہ قرآن اور عربی زبان وغیرہ کی تعلیم وغیرہ۔ دینی مدارس نے اس کام میں ہمارے ساتھ تعاون کیا لیکن ہم وسائل کی کمی کی بناء پر اسے جاری نہ رکھ سکے۔ بھارت کے ڈاکٹر راشد شاذ نے یہی کام برج (Bridge) کے نام سے علی گڑھ یونیورسٹی کی سرپرستی میں شروع کیا لیکن ان کے متجددانہ عقائد و خیالات کی وجہ سے دینی مدارس نے ان کی مخالفت کی۔ لہٰذا جامعہ الرشید اگر جدید یونیورسٹیوں کے فارغ

التحصیل طلبہ کو دینی کورسز کرا رہی ہے یا اپنے طلبہ کو انگریزی اور کمپیوٹر سکھا رہی ہے تو یہ صحیح اور مفید ہے۔ لیکن وحدت تعلیم کا تصور اور جدید علوم کی اسلامی تشکیل نو کا تصور ان کے ہاں بھی موجود نہیں ۔اس طرح کی کچھ کوششیں اور بھی ہو رہی ہیں جیسے لاہور میں جامعہ لاہور الاسلامیہ، جامعہ اشرفیہ، جامعہ دارالعلوم اقبال ٹاؤن اور جامعہ مرکز علوم اسلامیہ منصورہ۔

اس سے پہلے ہم یہ ذکر بھی کر چکے ہیں کہ جدید تعلیم اور اس کی اسلامی تشکیل نو کے کام کو علماء کرام سرے سے کوئی دینی کام یا دینی ذمہ داری ہی نہیں سمجھتے جس کا ایک ذاتی مشاہدہ ہمیں یوں ہوا کہ لاہور کی ایک بہت بڑی جامعہ کے ذمہ دار نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے ایک جدید اسلامی سکول میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے لیکن وہ کوئی زیادہ منافع نہیں دے رہا اور وہ سوچ رہے ہیں کہ وہ وہاں سے اپنے پیسے واپس لے کر کہیں اور انویسٹ کر دیں۔

یاد رہے کہ دینی مدارس اگر اصلاحی کام کرنا چاہیں تو اس کی تین بڑی صورتیں ہیں:

ایک: یہ کہ موجودہ درس نظامی پر نظر ثانی کی جائے اور اس کی تجدید کی جائے۔ بقول حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اس میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو قابل اخراج ہیں اور اس میں بہت سے اضافوں کی ضرورت ہے (یہ تفصیل ہم نے اپنی دوسری تحریروں میں دی ہے، وہاں دیکھی جا سکتی ہے)۔

دوم: جدید تعلیم کی بحیثیت مجموعی اور خصوصاً عمرانی علوم کی اسلامی تشکیل نو کرنا، اس کے لیے تربیت کا نظام وضع کرنا اور اسلامیات کے نصاب پر نظر ثانی کرنا۔

سوم: وحدت تعلیم کے تصور کو عملی شکل دینا۔

یاد رہے مسلمانوں کا نظام تعلیم بارہ سو سال تک بلکہ ملا نظام الدین سہالویؒ کا درس نظامی بھی وحدت تعلیم کے تصور پر استوار تھا لیکن دیوبند نے اور اس کے اتباع میں پاکستان میں موجودہ ہزاروں دینی مدارس نے اس درس نظامی کو چھوڑ رکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ دینی مدارس کو چاہیے کہ وحدت تعلیم کے نظام کو قائم کریں۔ اور ہم جو یہ کہہ

رہے ہیں تو ہم کوئی اس خیال کے داعی اوّل نہیں ہیں بلکہ ہم تو اس کی محض تذکیر کر رہے ہیں کیونکہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے یہی کہا ہے[1] مولانا حسین احمد مدنیؒ کی یہی رائے تھی[2]۔ ہم نے کئی دفعہ مدارس سے کہا ہے کہ آپ ہماری نہ سنیے، اپنے بزرگوں کی ہی مان لیجیے، اپنے اسلاف کی پیروی کیجیے لیکن وہ سننے اور غور کرنے کو تیار نہیں۔ صحیح کہا ہے اقبال نے کہ ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

---

[1] مولانا مناظر احسن گیلانی ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیم و تربیت، آخری فصل

[2] ہمارا مرتب کردہ 'نصاب مدنی' جس میں ہم نے مولانا کے ۱۹۳۳ء میں سلہٹ میں تیار کردہ جدید نصاب کو توضیحات کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

حال اور مستقبل

باب سوم

ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت

فصل اوّل: نظری پہلو

مبحث اوّل: مجوزہ یونیورسٹی کے بنیادی نظری اصول

مبحث دوم: مجوزہ یونیورسٹی۔ چند پیشہ وارانہ تفصیلات

فصل دوم: عملی پہلو

ہم نے اس کتابچے کی پہلی فصل کو 'ماضی'، دوسری کو 'حال' اور تیسری کو 'مستقبل' کی بجائے 'حال اور مستقبل' کا عنوان دیا ہے کہ ہماری مجوزہ یونیورسٹی ضروری نہیں کہ مستقبل ہی میں قائم ہو اور وہ مستقبل ہی کی ضرورت ہے بلکہ وہ آج بھی قائم ہو سکتی ہے اور آج بھی اس کی ضرورت ہے اور وہ آج ہی قائم ہونی چاہیے اور ہم اسی کے لیے کوشاں ہیں۔ اگر چہ ہوگا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا اور اس کی مشیت ہوگی اور ہم اس کی مشیت پر راضی ہیں "رضیتُ باللّٰہِ ربًّا وبالإسلامِ دینًا وبمُحمدٍ نبیًّا والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت"۔

فصل اوّل: ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت۔ نظری پہلو

پچھلے دو ابواب میں ہم نے جو گزارشات پیش کی ہیں ان کے مطالعے سے ایک ذہین قاری بآسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ تعلیمی ثنویت ایک ناسور ہے جو استعمار کا تحفہ ہے۔ ہم اگر اپنے نظام تعلیم کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور اس سے وہ نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کو مطلوب ہیں تو یہ بالکل ناگزیر ہے کہ وحدت تعلیم کی بنیاد پر نئے تعلیمی نظام کی اسلامی تشکیل نو کی جائے کیونکہ جدید تعلیم کا مغرب زدہ علی گڑھ ماڈل ہمارے مسائل حل نہیں کر رہا بلکہ ہمارے لیے مسائل پیدا کر رہا ہے بلکہ خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اور یہی حال ان دینی مدارس کا ہے جو دیوبند ماڈل کو اپنائے ہوئے ہیں کہ وہ ان مقاصد کو پورا کرنے کے اہل ہی نہیں جو ایک اسلامی معاشرے کو اسلامی نظام تعلیم و تربیت سے مطلوب ہوتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان دونوں رول ماڈلز کو ترک کر کے ایک نیا نظام تعلیم اور ابتداءً ایک نیا رول ماڈل تعلیمی ادارہ سکول تا یونیورسٹی کھڑا کرنا پڑے گا۔

نیا رول ماڈل تعلیمی ادارہ (خصوصاً یونیورسٹی) کن نظری اصولوں پر کھڑا کیا جائے گا، اس کا ذکر بالواسطہ طور پر پچھلی دو فصلوں میں آ چکا لیکن وضاحت کی خاطر ہم چاہیں گے کہ دوبارہ ان کا ذکر کر دیں تا کہ بات دو اور دو چار کی طرح قارئین پر واضح ہو جائے اور کسی

ابہام اور غموض کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

مجوزہ یونیورسٹی کی نظریاتی بنیادوں کے حوالے سے بحث کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

مبحث اوّل: مجوزہ یونیورسٹی کے بنیادی نظری اصول

اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ تعلیم کے اسلامی اصولوں کو بنیاد بنایا جائے۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ پاکستان میں مروج جدید تعلیم اور دینی مدارس دونوں کا تعلیمی ماڈل اسلامی لحاظ سے ناقص ہے اور نا قابل قبول ہے لہٰذا جب ہم نئے نظام تعلیم یا ایک نئی یونیورسٹی کی اسلامی تناظر میں تشکیل نو کرنا چاہتے ہیں اور اسے ری ماڈل یا ری ڈیزائن کرنا چاہتے ہیں تو ناگزیر ہے کہ ہم اسلامی اصولوں کی اس تشریح کو سامنے لائیں جسے سابق تعلیمی ماڈل نہیں اپنا سکے (یعنی اسبابِ زوال کا صحیح ادراک نہ کرنا اور دنیا پر غالب مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب ہو جانا یا اس کے ردّ عمل کا شکار ہو جانا)۔ چنانچہ ہم یہاں اس تناظر میں تعلیم کے مقصد اور اس کے تدریسی، تحقیقی اور تربیتی پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہم عصری دنیا میں یہ موضوعات فلسفۂ علم (Epistemology) اور فلسفۂ تعلیم کے حوالے سے زیر بحث آتے ہیں اور ہر تہذیب کا فلسفۂ علم و تعلیم پیداوار ہوتا ہے اس کے ورلڈ ویو کا اور ورلڈ ویو مبنی ہوتا ہے اس بنیادی آئیڈیالوجی یا عقائد پر جس میں اس تہذیب/ دین کے لوگ یقین رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کے بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت ہیں اور ان کی بنیاد پر جو ورلڈ ویو بنتا ہے وہ یہ ہے:

تصورِ الٰہ: ایک اللہ انسان (اور کائنات) کا خالق، مالک، رازق، ہادی، اس کی زندگی اور موت اور اس کے نفع و نقصان، غم اور خوشی پر قادر ہے۔

تصورِ انسان: انسان اللہ کا عبد ہے اور اس کا کام ہر حال میں اللہ کی عبادت و اطاعت

کرنا ہے۔[1]

تصورِ کائنات: موجودہ زندگی عارضی اور دارالامتحان ہے۔ انسان کا متحان اس میں ہے کہ وہ زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق گزارتا ہے یا نہیں؟ اس کا نتیجہ آخرت میں نکلے گا جہاں کی زندگی ابدی ہوگی۔ آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد اور اس ورلڈ ویو کی وجہ سے اسلام میں جو فلسفۂ علم اور تصورِ تعلیم سامنے آتا ہے اس کے اہم خطوط یہ ہیں:

مقصدِ تعلیم

اسلام میں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنا مقصد تخلیق پورا کر سکے۔ انسان کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ [الذاریات ۵۱:۵۶]

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں اس کی عبادت کریں اور اس کی اطاعت کریں یعنی دنیا کی یہ زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق بسر کریں۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو اس لیے مبعوث فرماتا ہے تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں اور انہیں بتائیں کہ اللہ کی عبادت و اطاعت کی زندگی کیسے بسر کرنی ہے؟ بلکہ وہ مطلوبہ زندگی انہیں گزار کر دکھائیں تاکہ ان کے لیے اللہ کو مطلوب زندگی گزارنا آسان ہو جائے۔

انبیاء کرام یہ کام کیسے کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی آخری نازل کردہ کتاب قرآن حکیم ہمیں بتاتی ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے۔ اگرچہ تربیت تعلیم کا جزء لاینفک اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے لیکن سہولت بیان کی خاطر ہم پہلے تعلیم کا ذکر کریں گے، پھر تربیت و تزکیہ کا اور اس کے بعد تحقیق کا۔

---

[1] تاہم عبد ہونے کے باوجود وہ اللہ کی طرف سے زمین پر خلیفہ بھی ہے بایں معنی کہ اسے اختیار حق و باطل بھی ہے اور کائنات میں تصرف کا اختیار بھی۔

تعلیم وتدریس

تعلیم میں تدریس کے ساتھ دعوت وتبلیغ بھی شامل ہیں کہ ان کا مقصد بھی تعلیم یعنی ابلاغ علم ہوتا ہے۔لوگوں تک صحیح علم پہنچے گا تو ہی وہ زندگی میں صحیح رویہ اختیار کرسکیں گے۔ اللہ کے نزدیک، صحیح علم وہ ہے جو اس کی صحیح معرفت عطا کرے یعنی ذات باری اور انسان و کائنات کے بارے میں صحیح علم عطا کرے۔توحید چونکہ علم کی بنیادی ترین حقیقت ہے لہٰذا قرآن دعوت سے مراد دعوت الی اللہ لیتا ہے۔ یہاں ہم پہلے مختلف انبیاء کرام کے پیغام دعوت وتعلیم کا ذکر کریں گے اور پھر اسلامی علمیات کی تفاصیل کا۔

انبیاء کرام کی تعلیم

قرآن حکیم میں تعلیم کے لیے دعوت، تبلیغ، انذار کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَهَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَاِنِّیۡ كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا ۚ﴿۷﴾﴾ [نوح ۷۱:۵ تا ۸]

''نوح علیہ السلام نے (اللہ تعالیٰ سے) کہا کہ: میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن (حق کی) دعوت دی ہے، لیکن میری دعوت کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہوا کہ وہ اور زیادہ بھاگنے لگے۔ اور میں نے جب بھی انہیں دعوت دی، تاکہ آپ اُن کی مغفرت فرمائیں، تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں، اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیے، اپنی بات پر اَڑے رہے، اور تکبر ہی تکبر کا مظاہرہ کرتے رہے۔''

حضرت ہود علیہ السلام:

﴿وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ

اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُفۡتَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾[ھود۱۱:۵۰]

''اور قومِ عاد کے پاس ہم نے ان کے (قومی) بھائی ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم نے جھوٹی باتیں تراش رکھی ہیں۔''

حضرت صالح علیہ السلام:

﴿وَاِلٰی ثَمُوۡدَ اَخَاهُمۡ صٰلِحًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ﴾[الاعراف۷:۷۳]

''اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے (قومی) بھائی صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

﴿وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِیۡمُ لِاَبِیۡهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصۡنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیۡۤ اَرٰىكَ وَقَوۡمَكَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۷۴﴾﴾[الانعام۶:۷۴]

''اور (اُس وقت کا ذکر سنو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ: کیا آپ بتوں کو خدا بنائے بیٹھے ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اور آپ کی قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

﴿اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۴۳﴾ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی ﴿۴۴﴾﴾[طٰہٰ۲۰:۴۳، ۴۴]

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ حد سے آگے نکل چکا ہے۔ جا کر دونوں اُس سے نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے، یا کہیں سرکشی پر آمادہ نہ ہو جائے۔''

تزکیہ و تربیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝﴾ [الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹]

''فلاح اُس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی، اور اپنے پروردگار کا نام لیا، اور نماز پڑھی۔ لیکن تم لوگ دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو، حالانکہ آخرت کہیں زیادہ بہتر اور کہیں زیادہ پائیدار ہے۔ یہ بات یقیناً پچھلے (آسمانی) صحیفوں میں بھی درج ہے، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام:

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝﴾ [النازعات ۷۹: ۱۷، ۱۸]

''تم فرعون کے پاس چلے جاؤ، اُس نے بہت سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ اور اُس سے کہو کہ کیا تمہیں یہ خواہش ہے کہ تم سنور جاؤ؟''

نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم:

دعائے ابراہیم علیہ السلام:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ﴾ [البقرہ ۲: ۱۲۹]

''ہمارے پروردگار! ان میں ایک رسول بھیج جو انہی میں سے ہو، جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے۔''

مومنوں پر احسان:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [آل عمران ۳:۱۶۴]

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا کہ اُن کے درمیان انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ یہ لوگ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

مقصدِ رسالت:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرہ ۲:۱۵۱]

''جیسے ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہارے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، تمہارے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے، اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الجمعہ ۶۲:۲]

''وہی ہے جس نے اُمّی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اُس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

نبی کریم ﷺ پر نازل کردہ کتاب چونکہ اللہ کی ہدایت کا آخری ورژن تھی اور آپ آخری نبی تھے یعنی آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہ تھا اس لیے اگر اسے ہم دین کا اکمل ترین اظہار سمجھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور ان کی دنیا

وآخرت میں کامیابی کا جو فارمولا نبی کریم ﷺ کو عطا فرمایا وہ چار چیزوں پر مبنی تھا:

۱۔تلاوت کتاب ۲۔تعلیم کتاب ۳۔تعلیم حکمت ۴۔تزکیہ

اب یہ بات بآسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ تلاوت کتاب (یعنی کتاب کا پڑھنا) تعلیم کتاب ہی کا ایک حصہ ہے اور تزکیہ پڑھنے کی بجائے تعلیم کا نتیجہ ہے اور تعلیم اس کا ذریعہ ہے لہٰذا ہم اختصار کی خاطر کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں تعلیم سے مراد تعلیم کتاب وحکمت ہے مع تربیت وتزکیہ کے۔کتاب سے مراد ہے کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم یعنی وہ ہدایت جو اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں وحی (جبریل علیہ السلام) کے ذریعے نبی کریم ﷺ پر اتاری۔ آپ ﷺ کی سنت یعنی قرآن حکیم کی تلاوت، تفہیم اور اس پر عمل کے حوالے سے آپ نے جو وضاحت کی، اس کی حیثیت قرآن کی سرکاری/رسمی/Official تشریح کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ اس کی تشریح اور وضاحت کرو۔[1] اور یہ بھی ضمانت دی کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے وہ ہماری سند سے کہتا ہے اور اس کی بات غلط نہیں ہوسکتی۔[2] لہٰذا آپ کی سنت بھی گویا قرآن ہی کی ایک توسیعی صورت اور وحی غیر متلو یا وحی خفی ہے چنانچہ پچھلے ساڑھے چودہ سو سال سے سنت کے مآخذ دین ہونے پر امت مسلمہ کا اتفاق واجماع رہا ہے اور اس کے قرآن کے ساتھ ماخذ دین ہونے کا انکار نہیں کیا سوائے چند گمراہ لوگوں کے جیسے خوارج، معتزلہ اور عصر حاضر کے کچھ متجددین کے۔

گویا قرآن وسنت کی رو سے تعلیم کا تصور یہ ہے:

۱۔ تعلیم قرآن (وسنت) یعنی قرآن (وسنت) کی تعلیم مسلم نظام تعلیم کی بنیاد اور اس کا اہم جزو ہوگی اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس نظام تعلیم کی بنیاد قرآن وسنت نہ ہو اور جس نظام تعلیم کا اہم اور لازمی جزو قرآن وسنت نہ ہو اسے ہم اسلامی نظام تعلیم نہیں کہہ سکتے۔

---

[1] النحل ۱۶:۴۴

[2] النجم ۵۳:۳

۲۔ تعلیم حکمت یعنی وہ علوم جو عقل وحکمت پر مبنی ہوں۔ ان میں وہ عمرانی علوم بھی شامل ہیں جن میں براہ راست قرآن وسنت کا داخل ہو، خواہ جزوی ہی ہو جیسے سیاست ومعیشت وغیرہ۔ اور وہ بھی جو خالص عقلی ہوں یا جو انسانی تجربہ ومہارت پر مبنی ہوں اور شارع حکیم نے ازراہ نوازش وبندہ پروری انہیں دائرۂ تشریع کے اندر نہ رکھا ہو، مگر اسلوب ومقاصد کی حد تک جیسے زراعت وصنعت وغیرہ۔ بلاشبہ یہ علوم مدار ہدایت نہیں ہیں لیکن یاد رہے کہ انہیں ہی اللہ تعالیٰ نے "علم الاسماء" قرار دیا ہے۔[1]

یہ بھی ذہن میں رہے کہ تعلیم حکمت پر بھی تعلیم کتاب (قرآن وسنت) مہیمن اور بالادست ہے اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے صاف فرمایا کہ اس دین میں داخل کی جانے والی ہر وہ بات قابل ردّ ہے جس کی اصل دین میں نہ ہو[2]۔ اسے آپ نے بدعت قرار دیا جو سبب گمراہی ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اللہ کی ناراضی اور جہنم ہے۔

۳۔ علوم حکمت کا وہ حصہ جو خالصتاً مبنی بر انسانی عقل وتجربہ ہے یعنی سائنس وٹیکنالوجی۔

۴۔ تعلیم کتاب وحکمت کا لازمی نتیجہ تزکیہ کی صورت میں نکلنا چاہیے۔ تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے نفس انسانی کی ایسی عملی تربیت ہو جائے کہ وہ مقصد تخلیق یعنی اللہ کی عبادت واطاعت کو پورا کر سکے۔ اسے آج کی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں تعلیم کا مقصد ایسا فرد تیار کرنا ہے جو قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے پر قادر ہو اور یہ کام اس کے لیے سہل ہو جائے، اور اس کی طبیعت بن جائے۔ دوسرے لفظوں میں تعلیم کا مطلب ہے بچے کو عملی مسلمان بنانا تاکہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق گزار سکے اور آخرت میں اللہ کی رضا اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہو سکے۔

---

[1] البقرہ ۲:۳۱

[2] صحیح بخاری: ۲۶۹۷

مسلم علمیات میں تقسیم علوم

قرآن وسنت کی روشنی میں مسلمان ماہرین تعلیم علوم کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں:

علوم نقلیہ: وہ علوم جو وحی الٰہی پر مبنی ہیں اور ام العلوم ہیں یعنی قرآن وسنت

علوم آلیہ: وہ علوم جو علوم نقلیہ کی تفہیم وتطبیق میں مد ہیں جیسے اصول تفسیر، علم الجرح والتعدیل، علم اسماء الرجال وعربی زبان وغیرہ۔

علوم عمرانیہ: وہ علوم جن کا تقریباً نصف علوم نقلیہ پر مبنی ہے اور باقی نصف علوم عقلیہ واجتہادیہ پر

علوم عقلیہ: وہ علوم جو انسانی عقل وتجربہ پر مبنی ہیں۔ ان میں علوم نقلیہ کی ضرورت نہیں پڑتی سوائے اسلوبِ بیان ومقاصد کے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اگر ان اصولوں کا مجوزہ یونیورسٹی پر اطلاق کیا جائے تو اس کی شکل کیا ہوگی؟

مبحث دوم: مجوزہ یونیورسٹی۔ چند پیشہ ورانہ تفصیلات

تدریس

یونیورسٹی سطح پر تدریس کے بارے میں سوچ بچار کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں مروج نظام تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ سامنے رکھیں جو یہ ہے:

پری سکول	ایک سے دو سال تک
پرائمری سکول	۵ سال
مڈل سکول	۳ سال
سیکنڈری سکول	۲ سال
ہائر سیکنڈری سکول	۲ سال

کل عرصۂ سکول تعلیم	۱۲ سال
یونیورسٹی تعلیم: بی اے آنرز	۴ سال[1]
ایم فل	۲ سال
پی ایچ ڈی	۲ سال سے ۷ سال
کل عرصۂ تعلیم (کم از کم)	۸ سال

مجوزہ یونیورسٹی کے نصابات

پیشتر اس کے کہ ہم مختلف سطحوں کے نصابات کی بات کریں، ضروری ہے کہ ہم کچھ بنیادی اور اصولی امور کی وضاحت کر دیں:

۱۔ برصغیر کی تعلیمی تاریخ یہ ہے کہ دینی مدارس اپنی اسناد (ڈگریاں) جاری کرتے ہیں جنہیں حکومت منظور نہیں کرتی جیسے دیوبند، ندوۃ العلماء اور دوسرے مدارس۔ پاکستان میں تحتانی درجات (ثانویہ عامہ، خاصہ اور عالیہ) میں اگر کچھ عصری/ دنیاوی مضامین پڑھا دیے جائیں تو حکومت پاکستان ان کے معادلہ (یعنی میٹرک، ایف اے اور بی اے کے مساوی ہونے) کا سرٹیفکیٹ دے دیتی ہے۔ عالمیہ کی سند کو ایم اے اسلامیات وعربی کے مساوی قرار دیا جاتا ہے لیکن صرف علوم اسلامیہ پڑھنے پڑھانے کے لیے۔

دینی مدارس کی اسناد منظور نہ ہونے کا بڑا نقصان یہ ہے کہ ان کے فارغ التحصیل طلبہ کو معاشرے اور ریاست کے اداروں میں کام کرنے کا موقع نہیں ملتا اور کسب رزق ان کے لیے لاینحل مسئلہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ مدارس مساجد میں کھپ جاتے ہیں اور باقی معاشی لحاظ سے رُلتے رہتے ہیں۔

اگر ہم ثنویت کے خاتمے کے مسئلہ پر غور کریں تو اس کے دو ممکنہ حل/ ماڈل/ آپشن

---

[1] جسے اکثر اوقات BS یا گریجوایشن بھی کہہ دیا جاتا ہے اور یہ ایم اے کے مساوی ہوتی ہے۔

سامنے آتے ہیں۔ایک یہ کہ دینی مدارس کا ماڈل اختیار کیا جائے اور دوسرے یہ کہ یونیورسٹی ماڈل اختیار کیا جائے۔ہم دونوں کے بارے میں کچھ عرض کریں گے:

دینی مدرسہ ماڈل (برائے خاتمہ ثنویت وقیام جامعہ)

اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دینی مدرسہ کی تعلیم میں معاصر علوم کے اضافے کر دیے جائیں تا کہ طلبہ دینی تعلیم بھی حاصل کر لیں، جدید علوم سے بھی ناواقف نہ رہیں اور ساتھ ہی حکومت کی منظور شدہ ڈگریاں بھی انہیں مل جائیں۔ یہ ماڈل ممکن ہے لیکن اس میں دو موانع ہیں۔ایک یہ کہ ہمارے ہاں دینی مدرسہ کا ماڈل صرف صدقات وعطیات پر چلتا ہے اور اس میں طلبہ سے فیسیں نہیں لی جاتیں لہٰذا یہ ماڈل مالی طور پر خود کفالت (Self Sustaining) کی طرف نہیں جاتا۔یعنی جو فرد یا ادارہ مدرسہ قائم کرے گا اسے ہمیشہ کے لیے اس کے لیے عطیات وغیرہ کا انتظام کرنا پڑے گا۔اور دوسرے یہ کہ اگر اسے شروع سے لے کر آخر تک منظم کیا جائے یعنی اس میں آٹھ سالہ درس نظامی کے علاوہ سکول (پہلی سے آٹھویں تک) بھی ہو اور اعلیٰ تعلیم (ایم فل و پی ایچ ڈی) بھی ہو تو اس کے لیے درکار اسناد رکھنے والے اساتذہ بھی درکار ہوں گے اور نصاب میں بھی کچھ کتر بیونت کرنا پڑے گی کیونکہ موجودہ درس نظامی اور موجودہ جدید تعلیم کے نصابات کو علی حالہ چلانا ممکن نہیں ہوگا۔ نیز اس میں سکول سطح پر عمرانی وسائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ اور ایم فل و پی ایچ ڈی میں اسلام اور عمرانی علوم میں تخصص بھی کروانا ہوگا۔تو ان سارے اقدامات سے مجوزہ مدرسہ یا جامعہ کی جو صورت نکلے گی وہ موجودہ مروجہ دینی مدرسہ سے کچھ مختلف ہوگی۔خلاصہ یہ کہ یہ ماڈل ممکن تو ہے لیکن اس پر عمل کون کرے گا؟ کیا موجودہ دینی مدارس میں سے کوئی اس کے لیے تیار ہے؟ کیا حکومت پاکستان ایسے مدرسہ کے قیام کے لیے تیار ہے؟ بظاہر ان دونوں باتوں کے امکانات نظر نہیں آتے۔ ہم یقیناً ایسا ماڈل کھڑا کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لیے مالیات کہاں سے آئیں گے؟ اگر ہم اس کے لیے مالیات کا فراہم کر سکنے کے قابل ہوتے تو ہم

کب کے یہ ماڈل کھڑا کر چکے ہوتے۔ ہم نے 'البرہان' میں کئی دفعہ لکھا کہ اگر کوئی ایسا مدرسہ/ جامعہ قائم کرنا چاہے تو ہم بلا معاوضہ اس کی ہر ممکن مدد کریں گے لیکن ابھی تک کوئی مدرسہ اس پر تیار نہیں ہوا۔

یونیورسٹی ماڈل (برائے خاتمہ تعلیمی ثنویت وقیام جامعہ [اسلامیہ [1]])

ثنویت کے خاتمے اور جدید علوم کے ساتھ (بلکہ جدید علوم کو اسلام کے مطابق ڈھال کر) اور ان میں اسلامی علوم اور اسلامی تربیت کا اضافہ کر کے یونیورسٹی ماڈل کو استعمال کرتے ہوئے مجوزہ نئی یونیورسٹی قائم کی جاسکتی ہے اور یہ ہمارے نزدیک زیادہ قابل عمل ہوگی کیونکہ یہ معاشی طور پر خود کفیل ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں طلبہ سے فیسیں لینا مروج ہے اور چونکہ اس میں طلبہ کو حکومتی ڈگری ملتی ہے اور طلبہ معاشرے اور ریاست کے اداروں میں کھپ سکتے ہیں لہٰذا والدین اپنی اولاد کے 'مستقبل' کے لیے پیسے خرچ کرنے پر تیار ہوتے ہیں۔

اس ماڈل کے قیام میں جو بڑا خطرہ پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ اس کے چلانے والے کہیں مغربیت سے متاثر نہ ہو جائیں کیونکہ اس کی بنیاد موجودہ یونیورسٹی ماڈل ہی ہے جو بلاشبہ مغرب کے تعلیمی اصولوں پر مبنی ہے۔ یہ خدشہ بلاشبہ موجود ہے لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ اس کے علاوہ کوئی تیسرا ماڈل عملاً ممکن ہی نہیں الّا یہ کہ ریاست اس کی موید ہو۔ تو ان حالات میں اگر یونیورسٹی چلانے والے شعوری طور پر اس امر کے قائل ہوں کہ انہوں نے مغربی فکر وتہذیب کو ردّ کرنا ہے اور تعلیم کے مغربی ماڈل کو ردّ کرنا ہے نیز وہ اتنی اجتہادی بصیرت بھی رکھتے ہوں کہ قرآن وسنت کی روشنی میں، امت کے سابقہ تعلیمی تجربات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور آج کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم کا ایک نیا نظام اور یونیورسٹی کا ایک نیا

---

[1] ہم مجوزہ نئی یونیورسٹی کو عموماً 'اسلامی یونیورسٹی' نہیں کہتے کیونکہ ایک 'اسلامی یونیورسٹی' کے بارے میں عوام وخواص کا تاثر یہ ہے کہ اس میں صرف اسلامیات وعربی پر زور ہوگا۔ اس کی حکومت سے منظوری بھی ایک لاینحل مسئلہ ہوگی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ ایک عام یونیورسٹی ہو جسے اسلامی اصولوں کے مطابق چلایا جائے۔

ماڈل کھڑا کرسکیں تو مجوزہ یونیورسٹی کا قیام بالکل ممکن ہے۔ہم اسی کے داعی ہیں اور ہمیں اگر وسائل میسر آجائیں تو ہم ایسا ماڈل، ان شاءاللہ، کھڑا کرسکتے ہیں۔

مجوزہ یونیورسٹی کے مختلف سطحوں کے نصابات

ان نصابات کی مختلف سطحیں یہ ہیں

۱۔ پرائمری ومڈل

۲۔ سکینڈری وہائرسیکنڈری

۳۔ چارسالہ بی اے/ بی ایس آنرز

۴۔ ایم فل وپی ایچ ڈی

نصابات پرائمری ومڈل

۱۔ پرائمری ومڈل کو ہم نے ایک یونٹ اس لیے بنایا ہے کہ ان دونوں کے لازمی حکومتی امتحانات نہیں ہوتے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ اس مرحلے کے نصابات ہم جو چاہیں آزادی سے رکھ سکتے ہیں۔

۲۔ اس مرحلے پر ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ پرائمری کے چھ سالوں میں (بشمول پری سکول کا ایک سال) بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کی مستحکم بنیاد رکھ دی جائے جو آگے کی سطحوں کے لیے بنیاد کا کام دے کیونکہ یہ مرحلہ بچوں کی تعمیر شخصیت کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔

۳۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پرائمری کی اسلامیات میں وہ چیزیں طلبہ کو سادہ انداز میں پڑھادی جائیں جنہیں ''دین بالضرورہ'' کہا جاتا ہے یعنی اتنا دینی علم جو ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے یعنی بنیادی عقائد، عبادات، حلال وحرام اور اوامر ونواہی وغیرہ کیونکہ پرائمری کے بعد بہت سے بچے سکول چھوڑ جاتے ہیں۔پھر حصہ مڈل میں انہی کو بہتر انداز

میں پختہ کر دیا جائے۔

۴۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ نصوص کے لیے ہم نے ایک الگ مضمون تجویز کیا ہے کیونکہ قرآن وحدیث کا براہ راست مطالعہ ہمارے نزدیک ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔خصوصاً ہم نے قرآن مجید پر ترکیز کے لیے یہ تجویز کیا ہے کہ:

- پری سکول میں بچوں کو قرآنی قاعدہ اس طرح پڑھا دیا جائے کہ بچے صحیح مخارج کے ساتھ قرآن حکیم پڑھنا سیکھ لیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ عربی حروف ہجا کا قرآنی قاعدہ پہلے پڑھایا جائے اور اردو وانگریزی قاعدہ بعد میں اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ قاعدہ مجود قاری پڑھائے یا اس کی ریکارڈ شدہ آواز استعمال کی جائے۔

- پہلی سے چوتھی تک وہ ناظرہ ختم کرلیں۔ہم نے پانچویں کی بجائے چوتھی تک اس لیے کہا ہے کہ اکثر بچے (۴۰ سے ۵۰ فیصد) پرائمری کے بعد سکول چھوڑ جاتے ہیں۔اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ پانچویں میں بچے نماز کا ترجمہ اور نماز میں پڑھی جانے والی پارہ عمّ کی آخری سورتیں ترجمے کے ساتھ یاد کرلیں تاکہ یہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوسکیں۔

- پانچویں میں طالب علم قرآن حکیم کا لفظی ترجمہ اس طرح سیکھنا شروع کرے کہ وہ سمجھ کر سیکھے، رٹا نہ لگائے اور دسویں تک سارا قرآن حکیم باترجمہ پڑھ لے۔ہم نے اس کے لیے اپنے عمر بھر کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے ''تدریس القرآن'' کے نام سے اساتذہ اور طلبہ کے لیے الگ الگ کتابیں مرتب کردی ہیں جو بتدریج آگے بڑھ رہی ہیں (ان سطور کی تحریر کے وقت پہلے تین پارے تیار ہو چکے ہیں اور پہلا پارہ بہت سے سکولوں میں متداول ہے)۔

۵۔ حفظ قرآن کا ہم نے الگ نصاب دیا ہے تاکہ کسی مسلمان بچے کا سینہ قرآن سے خالی نہ ہو اور ہر مسلمان بچہ بتدریج آخری پارہ پرائمری میں حفظ کرلے اور بعد میں اہم سورتیں بھی جیسے یٰسین، ملک، واقعہ وغیرہ۔

۶۔ نصابی کتب کا ایک خاص پہلو یہ ہوگا کہ ان میں احادیث اور اسلامی موضوعات کے مواد کا انتخاب اس طرح کیا جائے گا کہ وہ تعمیر شخصیت و کردار اور تزکیۂ نفس میں بنیادی کردار ادا کرے اور اس کے لیے الگ سے کتابیں نہ تیار کرنی پڑیں۔

۷۔ منصوص اور مسنون دعائیں اور اذکار بھی بچے کو اس عرصے میں نہ صرف یاد کروا دیے جائیں گے بلکہ کوشش کی جائے گی کہ بچے عملاً ان کے پڑھنے کے عادی ہو جائیں۔

۸۔ عربی بطور زبان تیسری جماعت سے ہلکے پھلکے انداز میں پڑھائی جائے۔ اس سطح پر گرامر پر زیادہ زور نہ دیا جائے اور طریق مباشر سے کام لیا جائے۔

۹۔ انگریزی پانچویں جماعت سے شروع کی جائے۔ ہم اپنے مجوزہ ادارے میں اسے لازمی مضمون رکھنا چاہیں گے۔ اگرچہ عام سکولوں کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ انگریزی ہر سطح پر اختیاری ہونی چاہیے تاکہ عام بچے لازمی انگریزی میں فیل ہو کر تعلیم نہ چھوڑ بیٹھیں۔ ہم نے چھٹی کی بجائے، پانچویں کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ پرائمری میں زیادہ ڈراپ آؤٹ کے خدشے کی وجہ سے فارغ ہونے والے طلبہ انگریزی زبان کی مبادیات سے واقف ہوں تاکہ انہیں عملی زندگی میں مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۱۰۔ عمرانی علوم اور سائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ اس دوران جاری رہے گا۔

۱۱۔ عربی اور انگریزی کی تدریس کو ہم اس لیے موخر کرنا چاہتے ہیں کہ زبانیں سیکھنے کے حوالے سے ہماری رائے یہ ہے کہ طلبہ کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی مادری یا قومی و رابطے کی زبان (جیسا کہ ہمارے ہاں اردو ہے) میں پہلے اچھی طرح مہارت حاصل کر لیں۔ اور اس کے بعد کوئی دوسری زبان سیکھیں اور اس میں بھی عربی کو انگریزی پر فوقیت دی جانی چاہیے کیونکہ عربی ہر مسلمان کی ضرورت ہے جبکہ انگریزی کی ہر مسلمان کو اتنی ضرورت نہیں ہے۔

۱۲۔ یہ بھی واضح رہے کہ عمرانی و سائنسی علوم بلکہ زبانوں کی نصابی کتب کا مواد بھی

اسلامی تناظر میں مرتب کیا جائے گا تا کہ وہ غیر اسلامی اثرات اپنے ساتھ نہ لائیں۔ یونیورسٹی کا شعبۂ تعلیم اس کے لیے ایک ''کریکلم ڈویلپمنٹ سنٹر'' قائم کرے گا جو علوم اور نصابی کتب کی اسلامی تشکیل نو کا کام کرے گا اور ہر سطح اور ہر مضمون کے اساتذہ کو اس ایکسرسائز میں شامل رکھے گا۔

۱۳۔ پرائمری اور مڈل کے اس نصاب کو ہم نے اگلے دو صفحات میں ایک جدول کی صورت میں مرتب کر دیا ہے تا کہ یہ ساری تفصیلات ایک نظر میں سامنے آ جائیں۔

دوسری نصابی سطح (ثانوی واعلیٰ ثانوی تعلیم)

۱۔ اس سطح پر ہم چاہیں گے کہ علوم اسلامیہ کا الگ گروپ اسی طرح کام کرے جیسے اس وقت سائنس، آرٹس، کامرس اور آئی ٹی کے تخصصات (Specializations) کام کر رہے ہیں۔ بعض بورڈز اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اس وقت بھی درس نظامی گروپ کی اجازت دیتے ہیں۔ ہم اس گروپ میں درس نظامی سے زیادہ بہتر (اور Rich) اپنی مرضی کا نصاب پڑھا کر طلبہ سے کسی حکومتی بورڈ کا امتحان ریگولر یا پرائیویٹ دلوا دیں گے تا کہ طلبہ کو حکومتی ڈگریاں مل سکیں۔

۲۔ دیگر تخصصات کے لیے لازمی اسلامیات کا نصاب جاری رہے گا جو اس سطح کی موجودہ اسلامیات سے کہیں بہتر، وسیع اور جامع ہوگا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامیات لازمی کا یہ نصاب اس تخصص سے متعلق عمرانی علوم کو اسلامی تناظر میں پیش کرے تا کہ اس تخصص کے طلبہ فکری لحاظ سے مسلمان ہوں۔

۳۔ علوم اسلامیہ گروپ کے لیے اردو و انگریزی کے علاوہ عربی زبان پر ترکیز اور اس میں مہارت لازمی ہوگی تا کہ اس تخصص کے طلبہ بی اے آنرز میں عربی متون کا مطالعہ بسہولت کر سکیں۔ اس مرحلے پر فارسی بھی پڑھائی جائے گی تا کہ طلبہ برصغیر کے دینی و تہذیبی ادب سے بے بہرہ نہ رہیں۔ ویسے بھی صحیح بات یہ ہے کہ جس آدمی کو عربی و فارسی نہ آتی ہو، اسے اردو میں مہارت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ اور عصر حاضر میں جو شخص انگریزی میں مہارت نہ رکھتا ہو وہ عصری علوم میں مہارت رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

نوٹ: ہم سمجھتے ہیں کہ جدید تعلیم کا یہ ۲۲ سالہ دورانیہ (پری سکول کا ایک سال۔ مڈل تک ۸ سال۔ ثانوی واعلیٰ ثانوی کے چار سکول۔ چار سالہ گریجوایشن۔ دو سالہ ایم فل اور کم از تین سالہ پی ایچ ڈی) بلکہ یہ یقیناً ۲۲ سال سے زیادہ ہوتا ہے اور عموماً ۲۵، ۲۶ سال تک ممتد ہو جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ اکثر سکولوں میں پری سکول ایک سال سے زیادہ کا ہو گیا

ہے۔ پھر ایک امتحان پاس کرنے کے بعد رزلٹ کا انتظار کرنا پڑتا ہے (جو بدانتظامی کی وجہ سے موخر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح طلبہ کے کئی سال ضائع ہو جاتے ہیں)۔ پھر گرمیوں کی چھٹیوں کا طویل دورانیہ بھی ہوتا ہے۔ پی ایچ ڈی میں بھی اکثر طلبہ کو چھ سات سال لگ جاتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ تحصیل علم اس سے آدھے دورانیے میں ہوسکتی ہے (متحدہ عرب امارات میں اس کے بعض کامیاب تجربات بھی ہوئے ہیں) لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مثلاً میٹرک کے بعد کوئی طالب علم دو سال گزرنے سے پہلے ایف اے/ ایف ایس سی کا امتحان نہیں دے سکتا خواہ وہ کتنا ہی ذہین اور محنتی کیوں نہ ہو اور اس سطح کے نصابات کا احاطہ ایک سال میں بآسانی کرسکتا ہو۔ یہی حال بعد کے امتحانات کا ہے۔ اس لیے یہ ایک ایسی مجبوری ہے جو ہمیں برداشت کیے بغیر چارہ نہیں جب تک کہ پورا نظام تعلیم نہ بدلے جس کی ہم خواہش (اور کوشش) ہی کرسکتے ہیں لیکن اس کے نتائج ہمارے بس میں نہیں۔

تیسری نصابی سطح: گریجوایشن (چار سالہ)

اس سطح سے گویا یونیورسٹی کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔

۱۔ اگر تعلیمی ادارے کے پاس مالی وسائل ہوں تو اس سطح پر سائنسی مضامین بھی پڑھائے جانے چاہئیں۔

۲۔ ورنہ اسلامی علوم اور عمرانی علوم کی تدریس تو اس سطح پر ضرور ہی ہونی چاہیے۔

- اس مرحلہ میں اسلامی علوم کی تدریس میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا جانا ضروری ہے:

- قرآن وسنت کی نصوص کا مطالعہ، اگر پہلے نہ کیا گیا ہو تو اس سطح پر لازماً کرا دیا جائے مطلب یہ کہ ہمارے مجوزہ نصاب ونظام کو اگر پرائمری سے شروع کیا جائے اور سارے مراحل میں اس پر عمل ہو تو طالب علم کو مطالعہ نصوص کی ضرورت نہیں لیکن اگر مجوزہ جامعہ اس

وقت تک انتظار میں بیٹھے رہنے کی بجائے جب تک کہ اس کے اپنے اسکول کے طلبہ اس میں داخلہ لیں اگر موجودہ سسٹم کے طلبہ کو بی اے (آنرز) میں قبول کرنے کا منصوبہ بنائے تو سارے قرآن حکیم کا ترجمہ اور حدیث کے ایک بڑے مجموعے کا (جیسے مشکوۃ یا ریاض الصالحین کے علاوہ صحاح ستہ کے منتخب اجزاء کا مطالعہ طلبہ کو لازماً کرادیا جائے تاکہ انہیں علوم نقلیہ میں مہارت حاصل ہوجائے۔

- فقہ کی بجائے اصول فقہ کو زیادہ اہمیت دی جائے اور فقہ کا مطالعہ مسلک پرستی کی بجائے تقابل مذاہب کی صورت میں کرایا جائے تاکہ ہمارے ملک میں فرقہ واریت کا ناسور جو جڑیں پکڑ چکا ہے، ہمارے مجوزہ ادارے میں وہ پھل پھول نہ سکے۔ عصری قوانین اور اصول قانون کا مطالعہ بھی ضروری ہے اور کسی ہم عصر مغربی ریاست (مثلاً امریکہ) کے آئینی وقانونی ڈھانچے کا مطالعہ اور اقوام متحدہ کے قوانین کا تقابلی اور تنقیدی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اصول فقہ کے قواعد پر اطلاقی بحثیں اور مشقیں اس طرح کرائی جائیں کہ طلبہ میں جدید مسائل کے حل پر غور وتدبر کا سلیقہ اور اجتہادی ملکہ ان میں نمو پائے۔ ہمارے مدارس میں قرآن وحدیث پر بھی فقہ اور فقہی اسلوب واپروچ کا غلبہ ہے جس کا نقصان دہ ہونا واضح ہے بلکہ یہ بھی فرقہ واریت کے فروغ کا ایک سبب ہے۔ ظاہر ہے دین میں بنیادی چیزیں قرآن وسنت ہیں اور فقہ کی پوزیشن ہماری رائے میں تیسری بھی نہیں بنتی بلکہ اس کا شمار عمرانی علوم میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ امام غزالیؒ نے اپنی معرکہ آرا کتاب 'احیاء علوم الدین' کے پہلے باب 'کتاب العلم' میں بجا طور پر فقہ کو بنیادی دینی علوم میں شامل نہیں کیا۔

ہم فقہ کی اہمیت کا انکار نہیں کرتے اور بلاشبہ ہمارے اسلامی لٹریچر کا بڑا حصہ فقہی بحثوں پر مشتمل ہے اور قرآن وسنت کا ذخیرہ اس کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ کا تعلق روزمرہ زندگی کے مسائل سے ہے اور انسانی زندگی کی وسعتیں لامحدود ہیں اور زمان ومکان کا پھیلاؤ ان کو بحرنا پیدا کنار بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

اسے پورا دین مان لیا جائے یا کتاب وسنت کی نصوص اور اہمیت فقہ کے نیچے دب کر رہ جائے۔

- مسلم زوال کے اسباب اوران کے علمی، فکری اور تہذیبی اثرات اوراس زوال سے نکلنے کے نتائج تفصیل سے زیرغور آنا ضروری ہیں۔

- مغربی فکروتہذیب کی تفہیم اور اسلامی تناظر میں اس کا تنقیدی مطالعہ اس سطح کا ایک اہم مضمون ہونا چاہیے کیونکہ معاصر اسلام اور مسلم دنیا کو جس سب سے بڑے فکری، علمی اور عملی چیلنج کا سامنا ہے وہ مغربی فکروتہذیب ہی ہے اوراس کی تفہیم وتنقید سے غفلت بلاشبہ مہلک ہے۔

- اسلام کا مطالعہ اس سطح پر فرد کی شخصیت کی نمو اور سیرت کی تعمیر کے ماخذ کی حیثیت سے بھی ہونا چاہیے اور نظام اجتماعی (معاشرہ، ریاست اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبے جیسے سیاسی نظام، معاشی نظام وغیرہ) کی اساس کے طور پر بھی (یہ دونوں پہلو مروجہ دینی تعلیم میں اپنا جائز حصہ وصول نہیں کر پاتے)۔

- تربیت طلبہ کے لیے عملی اقدامات تعلیم وتدریس کا ایک حصہ ہوں گے۔

۴۔ عمرانی علوم کی تدریس میں مندرجہ ذیل پہلو سامنے رکھنے ضروری ہیں:

- عمرانی علوم کا آدھا حصہ نقلی علوم کی ہدایات پر مبنی ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منصوص اور ناقابل تغیر اصول دیے ہیں جبکہ ان کا باقی نصف عقلی اور اجتہادی ہے۔ اجتہادی سے مراد یہ ہے کہ زمان ومکان کی ضروریات اور تقاضوں کو مذکور شرعی اصولوں کی روشنی میں تفصیلی احکام سے پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ایک عظیم الشان اجتہادی سرگرمی ہے جو ہمیشہ جاری رہنی چاہیے۔ اسے جاری نہ رکھنے کا مطلب گویا یہ کہنا ہے کہ اسلام ہمیشہ کے لیے قابل عمل نہیں اور یہ دوسرے غیر اسلامی نظریات، اصولوں فلسفوں اور تہذیبوں کی پیروی کا جواز پیدا کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں خلاف اسلام ہیں اور

مسلمانوں کا اس طرف جانا اپنے اسلامی مستقبل کو خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنا ہے۔

- عمرانی علوم کی ترقی میں دوسری قوموں اور تہذیبوں کے علوم و تجربات سے محدود استفادہ کیا جاسکتا ہے خصوصاً ان کی وہ چیزیں لی جاسکتی ہیں جو Value-Loaded نہ ہوں۔

- لیکن مسلمان چونکہ دو اڑھائی صدیوں سے مغرب کے غلام ہیں اور یہ فکری و عملی غلامی آج بھی، کسی نہ کسی حیلے سے اور کسی نہ کسی شکل میں عملاً ممتد اور جاری ہے لہٰذا ہمیں زیادہ اور خصوصی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی لیے ہم اس رویے پر اصرار کرتے ہیں کہ پہلے علی الاعلان یہ کہا جائے کہ ہم مغربی فکر و تہذیب کو اصولاً ردّ کرتے ہیں اور اسے عملاً ردّ کیا جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ مغرب سے محدود اور مشروط استفادہ کتنا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟

- ہم تجویز کرتے ہیں کہ مجوزہ یونیورسٹی میں ایک اعلیٰ سطح کا ''سنٹر فار کریکلم ڈویلپمنٹ'' قائم کیا جائے جس میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جنہیں ہمارے ذکر کردہ اہداف اور طریق کار پر شرح صدر ہو اور جو ہر شعبے کے اساتذہ سے مل کر اس شعبے کے لیے اسلامی تناظر میں نصاب سازی کا کام جاری رکھے اور یہ کام ہمیشہ جاری رہنا چاہیے تاکہ تجربات کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی رہے اور یہ بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے۔

سائنس و ٹیکنالوجی

۱۔ سائنس و ٹیکنالوجی علوم حکمت کا اہم حصہ ہیں۔ خصوصاً اسلام اور مسلمانوں کی حریف مغربی تہذیب اس شعبے میں چونکہ بہت ترقی کر چکی ہے اس لیے اس شعبے میں تفوق کے لیے مسلمانوں کو سخت محنت درکار ہے۔

۲۔ اس کے لیے لیبارٹریز کے قیام اور تجربات کے لیے بہت زیادہ مالی وسائل کی ضرورت ہے جو ایک پرائیویٹ یونیورسٹی افورڈ نہیں کر سکتی۔

۳۔ یہ شعبہ خالص عقلی ہے یعنی اس کے لیے قرآن وسنت سے استنباط شرط نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس کی اسلامی تشکیل نو ضروری ہے جس کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ سائنس وٹیکنالوجی میں پیش رفت مقاصد شریعت کے مطابق ہو جیسے مسلمانوں نے ماضی میں ٹیکنالوجی میں خوب ترقی کی لیکن ایسی ترقی اسلامی نظام عبادات واخلاق ومعاشرت سے کبھی نہیں ٹکرائی۔ اس کے برعکس آج کی مغربی تہذیب کی ٹیکنالوجیکل ترقی اسلامی مقاصد کے لیے تباہ کن ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر محض ٹی وی اور موبائل کے برے اثرات کا جائزہ لے لیجیے۔ دوسری بات یہ کہ اس کا تناظر اور اسلوب اسلامی ہونا چاہیے جیسے آپ یہ نہ کہیں کہ ''ہائیڈروجن اور آکسیجن میں یہ خصوصیت ہے کہ جب وہ ایک خاص تناسب میں ملیں تو پانی بن جاتا ہے'' بلکہ یوں کہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہائیڈروجن اور آکسیجن میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ جب وہ ایک خاص تناسب میں ملیں تو پانی بن جاتا ہے۔'' اس سے فرق پڑتا ہے اور طالب علم کا ذہن اس سے متاثر ہوتا ہے۔

۴۔ مسلم ماہرین تعلیم میں سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سائنس کی اسلامی تشکیل نو کے بہت بڑے داعی اور علم بردار تھے اور وہ خود فلسفی ہونے کے باوجود سائنس کی اسلامائزیشن کو دوسرے شعبوں کی اسلامی تشکیل نو پر ترجیح دیتے تھے.... غالباً اس بناء پر کہ مغرب کی سائنسی ترقی نے مسلم اذہان کو مغلوب کر رکھا ہے اور وہ چاہتے تھے کہ مسلم اہل علم مغلوبیت کی اس فضا سے نکلیں چنانچہ انہوں نے 'سائنس کی دینیات' کے نام سے ایف ایس سی کے طلبہ کے لیے ایک نصابی کتاب بھی لکھی۔ معاصرین میں سے ڈاکٹر سید حسین نصر، ڈاکٹر مظہر اقبال اور بعض دوسرے اہل علم بھی اسلامی سائنس کے قائل اور علمبردار ہیں۔ ڈاکٹر مظفر اقبال نے تو کینیڈا میں 'سنٹر فار اسلام اینڈ سائنس' بھی قائم کر رکھا ہے۔[1]

۵۔ ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ دنیا پر اس وقت مغربی اجارہ داری کی بڑی وجہ اس کی

---

[1] اب اس ادارے کا نام ''سنٹر فار اسلامک سائنسز'' ہے۔

سائنس وٹیکنالوجی میں بالادستی ہے۔ لہٰذا مسلم امہ اگر نشأۃ ثانیہ اور اپنی عظمت گم گشتہ کی بازیافت کی خواہاں ہے تو جہاں اس کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد اور نظریۂ حیات پر از سرنو پختہ ایمان لا کر اپنی شخصیت کی اساسات کو بحال کرے اور عمرانی علوم کی اسلامی تناظر میں تدوین نو کرے، وہیں اس کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اسلامی تناظر میں نئی اور تخلیقی تحقیق کے ذریعے اپنی سائنس وٹیکنالوجی کو ترقی دے اور اس میں دوسری قوموں سے مسابقت کرتے ہوئے ان سے آگے نکلے۔ اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ سائنس وٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عالم اسلام اعلیٰ درجہ کی سائنسی جامعات اور ریسرچ لیبارٹریز قائم کرے۔

مجوزہ یونیورسٹی کا نظام تربیت وتزکیہ

۱۔ اوپر گزر چکا کہ تزکیۂ نفس حاصل دین اور مغز دین ہے۔ تعلیمِ کتاب وحکمت اگر صحیح خطوط پر استوار ہوگی اور نظام تعلیم تشکیل دینے والوں کے پیش نظر اگر تزکیۂ نفس یعنی اسلامی تناظر میں تعمیر شخصیت وکردار ہوگا تو اس کا نتیجہ لازماً نفسِ مزکیٰ کی صورت میں نکلے گا اور نکلنا چاہیے۔

۲۔ ان لوگوں کی رائے غلط ہے جو کہتے ہیں کہ موجودہ مغرب زدہ جدید نظام تعلیم تربیت نہیں کر رہا۔ وہ تربیت کر رہا ہے اور جیسا نظام تعلیم ہو وہ ویسی ہی تربیت کرتا ہے۔ موجودہ نظام تعلیم چونکہ مغرب کے نظام تعلیم کی بھونڈی نقالی پر مبنی ہے اور اس میں اسلام کا تڑکا لگانے کی مجبوری بھی شامل ہے لہٰذا یہ جمع اضداد ہے۔ یہ فرد کو نہ یکسو مسلمان بناتا ہے اور نہ یکسو مغربی (مثلاً امریکی یا برطانوی معاشرے کے فرد جیسا) بلکہ یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بناتا ہے۔ چونکہ فرد پر اسلام اور اس کے اصول واقدار کا رنگ چڑھتا ہی نہیں اور اس کا دماغ بیک وقت متضاد افکار کا مجموعہ بنا رہتا ہے لہٰذا فرد ہمیشہ فکری انتشار میں مبتلا رہتا ہے جس کا نتیجہ منطقی طور پر بے عملی کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ ہماری یونیورسٹیاں بالعموم دوٹانگوں

کے جانور پیدا کر رہی ہیں۔ اگر کسی پر گھر یا سکول کی اچھی تربیت کا اثر باقی رہ جائے تو وہ ایک استثنائی معاملہ ہے، نظام تعلیم کا ثمر نہیں۔

۳۔ مسلمانوں نے تصوف کے نام سے تزکیۂ نفس کے لیے جو ادارہ قائم کیا، وہ بنیادی طور پر بڑوں (Grown ups) کے لیے تھا یعنی جو بالغ افرادِ معاشرہ اپنی تربیت میں خامی محسوس کریں اور بہتر مسلمان بننا چاہیں، وہ اس ادارے سے استفادہ کرتے تھے۔ ابتداء میں یہ ادارہ صالح علماء کے ہاتھ میں تھا اور ٹھیک خطوط پر کام کرتا تھا لیکن بتدریج اس میں غیر اسلامی افکار کی آمیزش ہوتی چلی گئی اور اس میں غیر اسلامی رسوم ورواج در آئے.... لیکن یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں اگر چہ اس میں بھی مرشد کا کردار معلم ومربی کا کردار تھا اور شروع کی بعض خانقاہوں میں باقاعدہ دینی مدرسہ بھی ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں مرشد جو کچھ مریدوں کی تربیت کے لیے کہتا تھا، وہ ایک طرح سے غیر رسمی تعلیم ہی تھی۔ اور جس طرح ریگولر تعلیم میں ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں ہوتی ہیں، اسی طرح خانقاہ کی سرگرمیوں کو تزکیہ وتربیت کی سرگرمیاں ہی کہنا چاہیے لیکن ہم چونکہ اس وقت رسمی تعلیم اور یونیورسٹی کا ذکر کر رہے ہیں اس لیے ہم تربیت وتزکیہ بذریعہ تصوف کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ امت نے جو تجربات تزکیۂ نفس یا تعمیر سیرت وکردار کے لیے خانقاہوں میں کیے اور جو اصول وضوابط اور منہج وطریق کار انہوں نے وہاں اپنایا اس سے بالواسطہ استفادہ ہم ضرور کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے۔

۴۔ مجوزہ یونیورسٹی اپنے طلبہ کی تربیت یا تزکیۂ نفوس کیسے کرے گی؟ ۱۹۹۰ء میں جب ہم نے سکولوں کے لیے نظر ثانی شدہ نصاب ایک نیم سرکاری تعلیمی فاؤنڈیشن کے لیے تیار کیا تو ہم نے پندرہ بیس صفحے تربیت پر لکھے تھے۔ بعد میں ہم نے اسے ۱۵۰ صفحے کے ایک کتابچے ''تعلیمی ادارے اور کردار سازی'' کی صورت دی۔ مزید مطالعہ اور سوچ وبچار کے بعد ہم نے ۲۰۱۹ء میں ایک بڑی کتاب ''تعمیر سیرت ہینڈ بک وگائیڈ'' طبع کی جو تفصیل سے اس

موضوع کا احاطہ کرتی ہے کہ تعلیمی ادارے میں طلبہ وطالبات کی تربیت عملاً کیسے کی جائے؟

۵۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر نظام تعلیم کے پانچ اجزاء ہوتے ہیں ۱۔تعلیمی انتظامیہ ۲۔استاد ۳۔نصاب/کتاب ۴۔تعلیمی ادارے کا ماحول ۵۔طلبہ۔

مؤثر اسلامی تربیت ان میں سے کسی ایک شعبے کی فعالیت سے وجود میں نہیں آسکتی جب تک یہ سارے شعبے مل کر طلبہ کی تربیت اور تعمیر سیرت کے لیے کام نہ کریں۔تعلیمی انتظامیہ یعنی تعلیمی ادارے کے مالکان (یا بورڈ آف گورنرز، بورڈ آف ٹرسٹیز، سینٹ، سنڈیکیٹ وغیرہ) و منتظمین مثلاً سکول پرنسپل، ڈائریکٹر یا یونیورسٹی کا وائس چانسلر، ریکٹر، چیئرمین بورڈ آف گورنرز وغیرہ اگر تعلیم کو اسلامی خطوط پر استوار نہیں کرنا چاہتے اور اسلامی تناظر میں تربیتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے علمبردار نہ ہوں تو ظاہر ہے طلبہ کی اسلامی تربیت نہ ہو سکے گی۔

اساتذہ کا کردار بہت اہم ہے۔اتنا اہم ہے کہ وہ نصاب کی خامیوں اور مالکان کی عدم دلچسپی کے باوجود تربیت طلبہ کا کام کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں کیونکہ طلبا وطالبات ان کے ہاتھ میں نرم لوہے کی مانند ہوتے ہیں کہ وہ انہیں جدھر چاہیں موڑ سکتے ہیں۔لیکن مصیبت یہ ہے کہ بہت سے اساتذہ خود محتاج تربیت ہوتے ہیں اور انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں بعض تعلیمی سطحوں پر (مثلاً سکولوں میں) اساتذہ کی تربیت کا کچھ انتظام ہوتا ہے (یونیورسٹی سطح پر وہ بھی نہیں ہوتا) لیکن وہاں بھی ان کی تھوڑی بہت پروفیشنل تربیت ہوتی ہے کہ سبق کیسے تیار کرنا ہے، تدریس کیسے کرنی ہے؟ انہیں یہ نہیں سکھایا جاتا کہ انہوں نے خود کو اور طلبہ کو اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے لیے کیا ٹیکنیکس استعمال کی جاسکتی ہیں؟ وغیرہ یہ چیز تربیت اساتذہ کے نصاب میں شامل ہی نہیں۔وہ یہ چیز پڑھتے ہی نہیں۔انہیں اس پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تو وہ بچوں کی تربیت کیا خاک کریں گے!

مجوزہ یونیورسٹی اپنے اساتذہ کی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دے گی اور تربیت کے بغیر کسی استاد کو جامعہ میں پڑھانے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کے لیے جامعہ میں تربیت اساتذہ کا مستقل مرکز ہوگا جو ہمیشہ کام کرتا رہے گا اور جاب سے پہلے ٹریننگ اور آن جانب ٹریننگ دونوں کا مؤثر اہتمام کرتا رہے گا۔

نصاب اور نصابی کتاب یعنی وہ لوازمہ یا مواد جو آپ نے پڑھانے کے لیے استاد کو اور پڑھنے کے لیے طالب علم کو دینا ہے، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسلامی علمیات کی رو سے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا، اس کا اولیں اور بنیادی حصہ تعلیم کتاب یعنی قرآن حکیم کا ہونا چاہیے۔ عمرانی علوم بھی اس کے مطابق ہونے چاہئیں اور سائنسی علوم بھی قرآن وسنت کے مقاصد واسلوب کے خلاف نہیں ہونے چاہئیں۔ تعلیمی انتظامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا نصاب طلبہ کو مہیا کرے، تیار نہ ہو تو تیار کرائے۔ استاد کی ذمہ داری ہے کہ اگر نصاب میں اس لحاظ سے کوئی خامی ہے تو وہ اس کو دور کرے تاکہ صحیح علم طلبہ تک پہنچ سکے۔

ضروری ہے کہ نصاب صرف تھیوری یا علم تک محدود نہ ہو بلکہ عمل اور پریکٹیکل بھی جزو نصاب ہونا چاہیے جس طرح کہ سائنسی مضامین میں ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کافی نہیں ہے کہ نصاب میں نماز کا لوازمہ تو موجود ہو اور استاد اسے پڑھا دے بلکہ یہ امر بھی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے کہ استاد طلبہ کو نماز زبانی یاد کرائے، پھر انہیں عملاً نماز ادا کر کے دکھائے، پھر طلبہ اس کے سامنے نماز ادا کریں۔ پھر وہ انہیں پانچ وقت فرض نماز ادا کرنے کی نصیحت کرے، پھر ان سے وقتاً فوقتاً پوچھتا رہے کہ وہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں یا نہیں؟ یہ ساری چیزیں نصاب کا حصہ ہونی چاہئیں، پھر ہی یہ علم پر عمل سکھائے گا، پھر ہی تربیت ہوگی اور پھر ہی تزکیۂ نفوس ہوگا۔

تعلیمی ادارے کا ماحول تربیت کرنے والا ہو۔ اس کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ نصابی اور تدریسی کام تربیت کرنے والا ہو وہاں ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں بھی اس میں

ممد ہوں مثلاً صفائی پر صرف سبق پڑھا دینا کافی نہیں بلکہ صفائی کے لیے ڈبے/کنٹینر تعلیمی ادرے میں موجود ہونے چاہئیں۔ طالب علموں کے لباس اور وضع قطع کی چیکنگ ہونی چاہیے۔سکول میں طلبہ کو چیک کرنا چاہیے کہ وہ نہا کر آتے ہیں یا نہیں؟ ان کے جوتے اور کپڑے صاف ہیں یا نہیں؟ یونیورسٹی میں بھی بعض اوقات طلبہ گھریلو لباس (یا Casual Dress) میں یونیورسٹی آجاتے ہیں جیسے قینچی چپل پہنے ہوئے یا بنیان نما ٹی شرٹ پہنے ہوئے۔ اور کئی لڑکیاں ناکافی لباس اور بہت میک اپ کر کے یونیورسٹی آجاتی ہیں۔ ان چیزوں پر نظر رکھنی چاہیے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا یونیورسٹی میں مسجد یا مسجدیں موجود ہیں۔ ان میں امام اور مؤذن کی تقرری ہوتی ہے یا نہیں؟ اور طلبہ نماز ادا کرنے جاتے ہیں یا نہیں؟ یہی انتظام ہوسٹلوں میں بھی ہونا چاہیے۔نماز کا ذکر ہم نے بطور مثال کیا ہے۔اسی طرح دوسرے اخلاقی معاملات پر بھی طلبہ کی نگرانی کا ماحول ہونا چاہیے۔مخلوط تعلیم اوّل تو ہونی نہیں چاہیے اور اگر ہو تو وہاں خصوصی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً لڑکیوں کی کنٹین الگ ہونی چاہیے، ان کا کھیلوں کا میدان الگ ہونا چاہیے۔ان کے لیے مسجد الگ ہونی چاہیے یا مسجد میں ان کے نماز ادا کرنے کا الگ راستہ، الگ وضو خانہ اور الگ نماز کی جگہ ہونی چاہیے، پکنک کے پروگرام الگ الگ ہونے چاہئیں۔کلاسوں میں ان کو الگ الگ بٹھانا چاہیے۔ اساتذہ کو انہیں الگ الگ اسائنمنٹس دینی چاہئیں....وغیرہ۔

یونیورسٹی میں تربیت طلبہ کا باقاعدہ شعبہ ہونا چاہیے۔ ہر کالج میں بلکہ ہر کلاس میں ایک تربیت کمیٹی ہونی چاہیے۔ ایک موزوں استاد اس کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔طلبہ میں سے بھی ایک مذکورہ استاد کا نائب ہونا چاہیے۔ہم نے تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت و کردار پر جو ہینڈ بک تیار کی ہے اس میں تربیتی کمیٹی کے قیام اور اس کی ورکنگ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

مجوزہ یونیورسٹی میں طلبہ کی تربیت کا ایک پورا نظام اور نیٹ ورک ہوگا۔تربیت طلبہ کا

مستقل شعبہ ہوگا جو متنوع سرگرمیوں کے ذریعے تربیت طلبہ کی سعی کرتا رہے گا اور کوشش کرے گا کہ یونیورسٹی کا ماحول اسلامی تربیت کے لیے سازگار رہو اور اس میں ممد و معاون ہو۔

طلبہ کا کردار: طلبہ کو اگر یہ باور کرا دیا جائے کہ یونیورسٹی وقت گزاری اور عیش و آرام کی جگہ نہیں ہے بلکہ کچھ سیکھنے کی جگہ ہے تا کہ وہ کل کامیاب عملی زندگی گزار سکیں اور بحیثیت مسلمان اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکیں تو شاید ان کا رویہ بدل جائے۔ اگر ہر یونیورسٹی میں فعال تربیتی کمیٹی ہو جو طلبہ میں یہ شعور اجاگر کرنے کی کوشش کرے تو موجودہ حالات بدل سکتے ہیں۔ مجوزہ یونیورسٹی کا شعبۂ تربیت طالب علموں میں مذکورہ ماحول پیدا کرنے کے لیے متنوع سرگرمیاں منظم کرے گا۔

مجوزہ یونیورسٹی میں تحقیق

۱۔ سکول سطح پر صرف تدریس ہوتی ہے جبکہ یونیورسٹی سطح پر تدریس کے علاوہ تحقیق بھی ہوتی ہے بلکہ یونیورسٹیاں بنیادی طور پر ہوتی ہی تحقیق کے لیے ہیں اور تدریس اس کا ایک جزو ہوتی ہے۔ پاکستانی یونیورسٹیوں میں تحقیق ہوتی تو ہے لیکن یہ اتنی نمایاں، مفید اور اعلیٰ پائے کی نہیں ہوتی۔ ہم کوشش کریں گے کہ ہماری مجوزہ جامعہ میں اعلیٰ پائے کی تحقیقی سرگرمیاں غالب ہوں۔

۲۔ تحقیق کا مطلب ہمارے ہاں عموماً جمع معلومات ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے ایک کتابچہ لکھا تھا کہ تحقیق کیا ہوتی ہے اور اس کے بنیادی اصول کیا ہوتے ہیں۔ اس میں انہوں نے مکینیکل ریسرچ اور تخلیقی ریسرچ میں فرق کیا تھا۔ حقیقی ریسرچ وہی ہوتی ہے جو تخلیقی ہو یعنی جس میں نئے آئیڈیاز پیش کیے جائیں کہ ۔سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا۔

۳۔ اسلامی اور عمرانی علوم میں ریسرچ کو ہم اجتہاد کہہ سکتے ہیں ۔یعنی ان دونوں

شعبوں میں تحقیق میں اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھنا ضروری ہے یا یوں کہیے کہ ان میں اسلامی مصادر (قرآن وسنت) کی مخالفت نہیں کی جاسکتی۔ سائنس وٹیکنالوجی میں ریسرچ البتہ ایک آزادانہ عقلی سرگرمی ہے لیکن اس میں بھی اسلامی اسلوب اور مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۴۔ اسلامی علوم میں تحقیق کا دائرہ کار کیا ہے؟ ظاہر ہے جہاں قرآن وسنت کا واضح حکم نص کی صورت میں موجود ہو وہاں اجتہاد نہیں ہوسکتا لیکن دو شعبے ایسے ہیں جن میں نصوص میں بھی تحقیق واجتہاد کی گنجائش نکلتی ہے وہ ہیں: نص کا مفہوم متعین کرنا اور اس کی تطبیق۔ ان دو شعبوں میں علماء اسلام شروع سے داد تحقیق دیتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی اس کی گنجائش موجود ہے۔

عمرانی علوم میں چونکہ اصولی بنیادیں قرآن وسنت فراہم کرتے ہیں لہٰذا باقی تقریباً ۵۰ فیصد ریسرچ کا تعلق مقامی اور عصری حالات سے ہوتا ہے لہٰذا اس میں فیلڈ ریسرچ، ڈیٹا ریسرچ یا Quantitative Research کی ضرورت ہوتی ہے اور ہونی چاہیے البتہ اس ریسرچ کے نتائج کو اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی پر منتج نہیں ہونا چاہیے اور اگر ہو تو وہ ریسرچ قابل ردّ ہوگی۔

سائنس وٹیکنالوجی میں ریسرچ بہت اہم ہے اور یہ بڑی حد تک آزادانہ عقلی سرگرمی کا نام ہے۔ البتہ اس کے مقاصد اور اسلوب اسلامی ہونا چاہیے۔

۵۔ بدقسمتی سے مسلمان معاشرے اس وقت تحقیق کے لحاظ سے بانجھ ہیں۔ اسلامی علوم میں تحقیق روایتی اور پھسپھسی ہے۔ متقدمین کی آراء کو نقل وجمع کر دینا ہی تحقیق سمجھا جاتا ہے۔ عمرانی علوم میں اور ان کی اسلامی تشکیل نو کے حوالے سے بہت کم ریسرچ اسلامی حلقوں میں ہو رہی ہے۔ دینی مدارس اور ان کے علماء کے ہاں تو ایسی ریسرچ کا کوئی تصور ہی نہیں اور سائنس وٹیکنالوجی میں ریسرچ مسلمان معاشروں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

مغرب کی ریسرچ کو سمجھ لینا، اس کی نقل اتارنا اور اس کی جگالی کرتے رہنا ہی ریسرچ سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ کوشش کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی، نہ حکومتیں اس کے لیے وافر بجٹ رکھتی ہیں۔

۶۔ ہماری مجوزہ یونیورسٹی اسلامی علوم اور عمرانی علوم میں تخلیقی ریسرچ کو ہدف بنائے گی۔ اور مادی وسائل میسر ہوئے تو سائنس وٹیکنالوجی میں تحقیق کرنا بھی اپنا فرض سمجھے گی۔

۷۔ اسلامی علوم میں جن موضوعات پر ریسرچ ہونی چاہیے، ان کا ایک وسیع دائرہ ہے۔ ہم ان میں سے بعض اہم دائروں کا ذکر کریں گے کہ یہ تفصیلات کا محل نہیں:

۱۔ تعلیم وتزکیہ اور ان کے اداروں کی اسلامی تشکیل نو

۲۔ مسلم عروج وزوال کے اسباب ونشاۃ ثانیہ کی حکمت عملی

۳۔ مغربی فکر وتہذیب کی تفہیم اور اس کا تنقیدی مطالعہ۔ اسلامی تناظر میں تنقیدی مطالعے میں مغرب کے بنیادی نظریات (ہیومنزم، سیکولرازم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم وغیرہ)، اہم فکری تحریکیں (تحریک نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح مذہب، رومانوی تحریک، تحریک تنویر، تحریک جدیدیت، تحریک پس جدیدیت وغیرہ)، اہم مغربی مفکرین اور فلسفیوں میں سے ہر ایک کا اسلامی تناظر میں تنقیدی مطالعہ (جیسے فرائیڈ، ڈارون، روسو، میکڈوگل، کارل مارکس، کانٹ، ہیگل، ہائیڈیگر وغیرہ)۔

۴۔ امت مسلمہ، مسلم معاشروں اور مسلم ممالک کے زندہ مسائل مثلاً مغرب کی فکری وعملی غلامی سے چھٹکارا کیسے پایا جائے؟ سیاسی، تعلیمی اور معاشی مسائل کیسے حل کیے جائیں؟

مبحث دوم: عملی پہلو

۱۔ پاکستانی حکومتوں کو (جو بھی فوجی اور سویلین حکومتیں آج تک برسر اقتدار آئیں یا آئندہ جن کے برسر اقتدار آنے کا امکان ہے) ان سے اس طرح کی یونیورسٹی کے قیام کی حمایت حاصل کرنے کا کوئی امکان ہمیں دور دور تک نظر نہیں آتا جس کی تجویز ہم دے رہے

ہیں بلکہ ان کی تو یہ حالت ہے کہ جو تھوڑا بہت کام کہیں درست سمت میں ہو رہا تھا اس کو بھی حکومتی اداروں نے بگاڑ کر رکھ دیا جیسے بہاولپور کی جامعہ عباسیہ ایک بڑے مدرسے کے طور پر بہاولپور ریاست میں کام کر رہی تھی۔ ریاست کے پاکستان سے الحاق کے بعد یہ طے ہوا کہ اسے جدید اسلامی یونیورسٹی بنایا جائے گا اور آج اس کی حالت یہ ہے کہ اس یونیورسٹی میں (جس کے نام میں ''اسلامیہ'' کا لفظ ابھی تک موجود ہے) اور ایک عام یونیورسٹی (جیسے پنجاب یونیورسٹی یا کراچی یونیورسٹی) میں کوئی فرق باقی نہیں رہا اور وہ جدیدیت کے سیلاب میں بہ گئی ہے۔ ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ پنجاب کے محکمہ اوقاف میں سیکڑوں مدارس کاغذوں میں موجود ہیں۔ لوگ تنخواہیں لے رہے ہیں، بورڈ لگے ہوئے ہیں لیکن کام کوئی نہیں ہو رہا۔ بس کاغذوں میں دینی مدارس چل رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کچھ عرصہ مرکز میں وزیر مذہبی امور رہے اور انہوں نے ماڈل دینی مدارس قائم کیے اور ان کے لیے بڑی اچھی نصابی اسکیم وضع کی لیکن ان کے وزارت چھوڑنے کے بعد وہ ساری کاوش غتر بود ہو گئی اور اب وہ برائے نام باقی ہیں۔

حکومت نے پرائیویٹ دینی مدارس کو کنٹرول کرنے کے لیے سرکاری سطح پر 'مدرسہ بورڈ' بنایا اور وہ برسوں سے کاغذوں میں موجود ہے لیکن اس کی کارکردگی صفر ہے کیونکہ دینی مدارس نے اس کے ساتھ الحاق سے انکار کر دیا اور حکومت اس معاملے کو آگے نہ بڑھا سکی۔

یہ ایک تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت ہے کہ پاکستانی ریاست اور اس کے اداروں کا مزاج سیکولر اور لبرل ہے۔ ملک کا جمہوری سیاسی نظام مکمل طور پر مغرب زدہ ہے اور برائے نام صرف کاغذوں میں اسلامی ہے۔ بیوروکریسی (سول اور فوجی دونوں) کی تربیت مغرب زدہ ماحول میں ہوتی ہے۔ عدلیہ اور پولیس کا بھی یہی حال ہے۔ رہی سیاسی اور فوجی حکومتیں تو وہ اسلام اور پاکستان کی بہ نسبت امریکہ و یورپ کی زیادہ وفادار ہوتی ہیں اور اسلام کے مقابلے میں مغربی فکر و تہذیب کو اپنانا اور اسے ملک میں رائج کرنا انہیں سہل لگتا ہے لہٰذا نظام

تعلیم کو اسلامی تناظر میں بدلنا نہ کبھی ان کی خواہش رہی ہے اور نہ آج ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم دن بدن زیادہ مغربی ہو رہی ہے اور اسی جیسا ذہن رکھنے والے افراد ہی جدید تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔

ان حالات میں اس امر کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ حکومت خود اس طرح کی یونیورسٹی قائم کرے یا کسی کو کرنے دے بلکہ اگر کوئی اس کی سعی کرے تو یقیناً اس کی ہر مرحلے میں مخالفت ہوگی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں گے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی جو عرب ممالک کی مالی اور تعلیمی مدد سے قائم کی گئی تھی اور اس کا آغاز بڑا شاندار تھا وہ بھی بتدریج ''جدیدیت'' کے اندھیروں میں گم ہو رہی ہے۔ بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی جیسا حال ہونے میں اسے ذرا دیر لگی جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا صدر کسی عرب ملک سے ہوتا ہے اور بہت سے اساتذہ بھی عرب ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس کے سورج کو بھی گہن لگ چکا ہے۔ ہم نے مرحوم ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب سے ایک طویل نشست ایک نئی اسلامی یونیورسٹی کے موضوع پر رکھی جس میں ان کے علاوہ اس وقت کے جامعہ کے نائب صدر ڈاکٹر ایس ایم زمان اور ڈین سوشل سائنسز ڈاکٹر اعجاز شفیع گیلانی بھی موجود تھے اور ڈاکٹر صاحب کے بھائی ڈاکٹر محمد الغزالی بھی موجود تھے جبکہ میرے ساتھیوں میں پروفیسر ملک محمد حسین صاحب (معروف ماہر تعلیم اور تحریک اصلاح تعلیم کے سیکرٹری جنرل) اور معروف فلسفی اور صوفی جناب احمد جاوید بھی موجود تھے۔ اس میں ڈاکٹر غازی مرحوم اور ڈاکٹر زمان صاحب نے تسلیم کیا کہ علوم کی اسلامی تشکیل نو کا کام ان کی جامعہ میں نہیں ہو رہا بلکہ وحدت تعلیم (Integration) کا کام بھی نہیں ہو سکا مثلاً ایل ایل بی کی تعلیم پاکستانی اساتذہ انگریزی میں دیتے ہیں جنہیں نہ عربی آتی ہے اور نہ وہ علوم شریعت اور فقہ و اصول فقہ سے واقف ہوتے ہیں۔ اور فقہ و اصول فقہ کی کتابیں عرب اساتذہ پڑھاتے ہیں جن کو نہ انگریزی آتی ہے اور نہ پاکستانی یا انگریزی قانون کا کچھ پتا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ کافی دیر تک یہ جامعہ صحیح خطوط پر کام کرتی رہی ہے اور اب روبہ زوال ہے، پھر بھی

ساری پاکستانی یونیورسٹیوں اور ان کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ سے بدر جہا بہتر ہے۔ مئی ۲۰۲۰ء میں اخبارات میں آیا تھا کہ اس یونیورسٹی کی خصوصی حیثیت ختم کر کے اسے عام پاکستانی یونیورسٹیوں جیسا بنایا جارہا ہے، واللہ اعلم کہ یہ حادثہ فاجعہ کب رونما ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ روز بد نہ دکھائے۔

۲۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بعض بڑے دینی مدارس کام کررہے ہیں جن کے کار پردازان اگر چاہیں تو انہیں آسانی سے ہماری مجوزہ یونیورسٹی میں بدل سکتے ہیں لیکن دینی مدارس چلانے والے علماء کی جو ذہنی وفکری حالت ہم بیان کر چکے ہیں، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کوئی دینی مدرسہ اس طرح کی یونیورسٹی میں خود کو Convert کرنے پر تیار ہوگا۔

بلکہ جمعیت علماء اسلام (ف) کو صوبہ سرحد میں حکومت ملی اور انہوں نے کئی سال وہاں حکومت کی لیکن انہوں نے وہاں کوئی اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کے ارادے تک کا اظہار نہیں کیا، نہ موجودہ دینی مدارس کی اصلاح کا کوئی نقشہ تیار کیا اور نہ مغرب زدہ جدید تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی کوئی کوشش کی جس کا مطلب اس کے سوا کیا لیا جاسکتا ہے کہ انہیں اس کام کی اہمیت کا کوئی احساس ہی نہیں۔ نہ انہوں نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے اور نہ اس کے لیے کوئی کام کرنا ان کے پیش نظر ہے۔

جماعت اسلامی کے ہم خیال افراد کی تین یونیورسٹیاں (پشاور میں قرطبہ یونیورسٹی، اسلام آباد میں رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اور لاہور میں یو ایم ٹی (یونیورسٹی آف مینجمنٹ وٹیکنالوجی) کام کررہی ہیں لیکن وہ اسی طرح کی یونیورسٹیاں ہیں جس طرح کی دیگر پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں جن کے مالکان کے پیش نظر پیسے کمانا ہے اور مغرب زدہ جدید تعلیم دینا ہے اور بس۔

درحقیقت پاکستان میں تعلیم کمرشل ہو چکی ہے، کاروبار بن چکی ہے لہٰذا دوسرے لوگوں

کی طرح اسلامی ذہن کے لوگ بھی اسے کاروبار سمجھ کر چلا رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے علاوہ باقی لوگوں کا بھی یہی حال ہے جیسے میاں عامر محمود صاحب کی دو یونیورسٹیاں جو ماضی میں جماعت اسلامی سے وابستہ رہے ہیں۔ یونیورسٹی آف لاہور جس کے مالکان اہل حدیث ہیں اور منہاج یونیورسٹی وفیصل آباد یونیورسٹی جن کے مالکان بریلوی مکتب فکر کے پختہ پیرو بلکہ علمبردار ہیں بلکہ ان سب میں ایک خرابی جماعت اسلامی کے لوگوں کی یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے اور وہ یہ کہ ان کے اندر فرقہ واریت کے جراثیم ہیں جن کا دینی لحاظ سے ضرر رساں ہونا واضح ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح کی یونیورسٹی کی تجویز ہم پیش کر رہے ہیں، اسے قائم کرنے میں نہ پبلک سیکٹر کو دلچسپی ہے اور نہ پرائیویٹ سیکٹر کو اور ظاہر ہے بین الاقوامی حالات بھی اس کے موافق نہیں ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اس کے باوجود پاکستان میں اس امر کے خاصے امکانات موجود ہیں کہ ایسی یونیورسٹی قائم ہوسکتی ہے۔ راقم تسلیم کرتا ہے کہ اس کے اندر زیادہ تنظیمی صلاحیتیں نہیں ہیں اور نہ ہی وہ مارکیٹنگ کے فن سے واقف ہے۔ چنانچہ اس نے اس موضوع پر سوچا اور لکھا بہت ہے لیکن اس آئیڈیے کو Sell کرنے یا مارکیٹ کرنے کا کام وہ نہیں کرسکا اور نہ ہی کوئی ایسی بڑی ٹیم وہ کھڑی کرسکا ہے جو یہ کام کرتی۔ اگرچہ ہم نے اپنی حد تک محنت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور بعض دوستوں نے بھی اس میں میرا بہت ساتھ دیا ہے خصوصاً برادرم پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے لیکن ہماری کوششیں بار آور نہیں ہوسکیں۔ ہم اپنی کمزوریاں اور خامیاں تسلیم کرتے ہیں اور کسی کو موردالزام نہیں ٹھہراتے۔ ہمارا کام کوشش کرنا تھا وہ الحمدللہ ہم نے استطاعت بھر کی۔ نتائج ہمارے نہیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور ہم اس کی تقدیر پر اور اس کے فیصلوں پر راضی ہیں۔ ''رضیت باللہ ربًا وبالاسلام دینًا وبمحمدٍ نبیًا والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالٰی والبعث بعد الموت''. سچ

جدید تعلیم کے ادارے

	پری پرائمری	پرائمری	مڈل	ثانوی	اعلیٰ ثانوی	انٹر کالج	ڈگری کالج	یونیورسٹیاں
تعداد تعلیمی ادارے		1,45,829	45,680	31,740	4,475	995	1,418	163
تعداد طلبہ	87,45,103	1,78,51,995	64,45,697	34,37,306	16,97,443		9,37,132	13,55,649

کل تعلیمی ادارے: 2,25,300

کل تعداد طلبہ: 4,13,70,025

دینی مدارس (۲۰۱۵-۲۰۱۶)

	وفاق المدارس العربیہ	تنظیم المدارس	وفاق المدارس السلفیہ	رابطۃ المدارس	وفاق المدارس الشیعہ	غیر رجسٹرڈ
تعداد دینی مدارس	9,457	7,068		2,439	2,343	1,994
تعداد طلبہ وطالبات	9,06,813	4,78,519		1,82,049	1,34,215	87,708

تازہ اعداد وشمار

کل مدارس: 32,272

کل طلبہ: 22,57,253

کل مساجد: 5,00,000 اندازاً

فرمایا تھا حضرت علیؓ نے کہ عرفتُ ربّی بفسخ العزائم۔ [1]

ہم نے عمر بھر کوشش کی اور دعا بھی مانگتے رہے۔ ہم آج بھی اپنے مشن میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگتے ہیں۔ یہی استقلال ہمارا سرمایہ ہے اور جب تک ہم زندہ ہیں کوشش کرتے رہیں گے اور اللہ سے مانگتے رہیں گے، ان شاء اللہ، کیونکہ اگر وہ دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر وہ نہ دینا چاہیے تو کوئی دے نہیں سکتا۔ " اللّٰھم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذا الجد منك الجد ولا راد لقضائك ولا حول ولا قوۃ الّا باللہ العلی العظیم"[2]

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی معاشرے میں خیر ابھی باقی ہے۔ یہاں لوگوں کے پاس پیسہ بھی بہت ہے اور وہ اللہ کے نام پر دینے میں بھی بخل نہیں کرتے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں Convince کیا جائے کہ اس طرح کی یونیورسٹی قائم کرنا بہت اہم ہے۔ یہ دین کی بہت بڑی خدمت ہے، یہ امت کی اور ملت اسلامیہ پاکستان کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ جس دن مخلص اور قابل لوگوں کی ایک منظم ٹیم اس مشن کو لے کر کھڑی ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری ہوگی تو اس یونیورسٹی کا قیام ممکن ہو جائے گا، ان شاء اللہ۔

بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ضروری نہیں ہے کہ اس یونیورسٹی کو دینی مدارس کی طرح خیراتی ادارہ بنایا جائے بلکہ اس کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے مالی طور پر خود کفیل بنانا ضروری ہے اور بنایا جاسکتا ہے۔ طلبہ کے والدین کے ساتھ مل کر انہیں قائل کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں بیٹیوں کی تعلیم کے لیے جتنا دوسری یونیورسٹیوں میں خرچ کرتے ہیں اس یونیورسٹی پر بھی خرچ کریں جبکہ اس کی تعلیم دوسری یونیورسٹیوں سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ اس کے لیے ایک قابل عمل نظام وضع کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ 'الحِکم' الحکمۃ ۲۴۷

[2] صحیح البخاری: ۷۲۹۲

بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب مالدار ہوں اور سارا نفع یا زیادہ سے زیادہ نفع دنیا ہی میں نہ لینا چاہتے ہوں بلکہ کچھ منافع آخرت میں اللہ سے بھی لینا چاہتے ہوں اور یہاں جو تھوڑا بہت مل جائے اس پر قناعت کے لیے تیار ہوں تو یہ یونیورسٹی کمرشل بنیادوں پر بھی چل سکتی ہے۔ لیکن اگر کوئی سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ نفع اور ہر قیمت پر نفع چاہتا ہو تو پھر یونیورسٹی تو چل سکتی ہے (اور پہلے بھی کئی چل رہی ہیں) لیکن اس سے اسلامی مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔

ہم عام لوگوں کی معلومات کے لیے یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ پاکستان کے نظام تعلیم میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ڈگری دینے والے اداروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مکمل یونیورسٹی جس کے لیے بہت زیادہ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے ڈگری ایوارڈنگ انسٹی ٹیوٹ (DAI) جس کے لیے یونیورسٹی کے مقابلے میں بہت کم اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے چند کروڑ روپے سے کام شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ڈگری جاری کرنے اور دیگر امور میں وہی خود مختاری حاصل ہوتی ہے جو ایک یونیورسٹی کو ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ ہوگا اسے ہم یونیورسٹی نہیں کہہ سکتے اور دوسرے یہ کہ انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی جتنا وسیع نہیں ہو سکتا۔ اسے گویا ایک چھوٹی یونیورسٹی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی کی طرح ہر لحاظ سے خود مختار ادارہ ہوتا ہے اور ہم نے جتنے کاموں کا سطور بالا میں ذکر کیا ہے وہ اس انسٹی ٹیوٹ کے تحت انجام دیے جا سکتے ہیں۔

آج اس توقع کے ساتھ ہم یہ منصوبہ ملت اسلامیہ پاکستان کے سامنے رکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگ سامنے آسکیں جو اس یونیورسٹی کے قیام کے لیے کام کر سکیں۔ انسان تو بہر حال فانی ہے۔ راقم عمر عزیز کی ۷۳ بہاریں دیکھ چکا ہے۔ کون جانے کس لمحے بلاوا آجائے لہٰذا ہم نے اسے صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا مناسب سمجھا کہ ہو سکتا ہے یہ منصوبہ ہماری زندگی میں پورا نہ ہو لیکن تعلیم کے بارے میں ہمارے خواب اور تصورات نئی نسل کے سامنے رہیں۔

ممکن ہے جو خواب ہم نے دیکھا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہمارے بعد پورا فرما دیں۔ اور اگر اس کی مشیت ہو تو ہماری زندگی میں بھی پورا ہو سکتا ہے وما ذلك على الله بعزيز

محمد امین

لاہور ۱۴ راگست ۲۰۲۱ء